عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم

طلوع اسلام

مارچ ۴۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طلوعِ اسلام (کراچی)

دورِ ثانی

مرتب
محمد یونس

بدلِ اشتراک
سالانہ دس روپے
ششماہی چھ روپے

جلد (۱)
قیمت فی پرچہ ایک روپیہ
شمارہ ۳

فہرست مشمولات

اے چشمِ اشکبار ۲
ہم پر کیا بیتی؟ ۳
وکالتِ حق و صداقت ۴
لمعات ۵
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے ۲۰
تقسیمِ ہند کا آئینی پہلو ۲۴
محاسبۂ نفس ۶۲
باب الاسلام "سندھ" ۸۱
ہدیۂ تہنیت بخدمت وزیر مالیات ۹۶
مجلس آئین ساز کے اراکین سے ۹۸
کچھ بھی نہیں (جناب ... ملتانی) ۱۰۸
دل سوز لواحقین کے تسلیم ہو لی؟ (جناب ابو شمیم سراج پاکستانی) ۱۰۹–۱۱۳

اے چشمِ اشکبار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو بہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

غالب نے اپنے خطوط میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ہجومِ مصائب و انبوہ مشکلات سے تنگ آکر میں نے اپنے آپ کو غالب کا غیر فرض کر لیا ہے۔ جب کوئی نئی مصیبت آتی ہے تو میں یہ کہکر خوش ہو لیتا ہوں کہ اچھا ہوا۔ غالب کے ایک اور لگی۔

غالب نے تو محض اپنے آپ کو جھوٹی تسکین دینے کے لئے یہ نفسیاتی کیفیت پیدا کی تھی۔ لیکن ہماری یہ حالت ہے کہ ہم نے سچ مچ ایسی ہی روش اختیار کر رکھی ہے۔ جب، گذشتہ حوادث کا ستایا ہوا، مفلوک الحال، خانماں برباد، ہمارا کوئی بھائی ہمارے قریب آتا ہے تو ہم اسے اپنے سے غیر سمجھ کر اس سے دور ہٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے پھٹے پرانے کپڑے ہمارے دل میں جذبۂ نفرت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کے چہرے کی پژمردگی ہماری نگاہوں میں اس کی صورت کو بھیانک بنا دیتی ہے۔ وہ اپنی داستانِ غم و الم ابھی شروع بھی نہیں کرنے پاتا کہ ہم اسے اس طرح دھتکار دیتے ہیں جیسے وہ کوئی ذلیل و خوار پیشہ ور گداگر ہو۔ حالانکہ یہ وہ تھا جو ابھی چھ ماہ قبل، ہزاروں کو کھلا کر کھاتا اور سینکڑوں کو پہنا کر پہنتا تھا۔ ہم سب اسے چودھری جی کہہ کر پکارتے اور سلام میں سبقت کرتے تھے۔ کچہریوں اور عدالتوں میں اس کی عزت اور محفلوں اور برادریوں میں اس کی توقیر تھی۔ پھر آج یہ کیا ہو گیا کہ وہ ہماری نگاہوں میں اس قدر ذلیل قرار پا گیا۔ کیا صرف یہی نہیں کہ ہم حسنِ اتفاق سے محفوظ رہ گئے اور وہ ہماری سوءِ تدبیر سے بھیڑیوں کے قابو آ گیا؟

تو کیا اس کا یہ "جرم" اتنا سنگین اور اس کا یہ "گناہ" ایسا نفرت آگیں ہے کہ وہ ہماری نگاہوں میں اس قدر ذلیل و خوار قرار پا جائے! اے وہ کہ جو اس سیلابِ حوادث اور طوفانِ بلا میں محفوظ رہ گئے ہو۔ یاد رکھو! ان خانماں خرابوں کی یہ مفلوک الحالی تمہاری پوری کی پوری قوم کی خستہ سامانی کی آئینہ دار ہے۔ اگر یہ ذلیل ہیں تو تم بھی صاحبِ توقیر نہیں ہو۔ اگر یہ قابلِ نفرت ہیں تو تم بھی مستحقِ عزت نہیں ہو اگر یہ محتاج ہیں تو تم بھی غنی نہیں ہو۔ اگر یہ کھبکاری ہیں تو تم بھی منعم نہیں ہو۔ ان کی ذلت تمہاری اپنی ذلت ہے۔ اس لئے اگر اس قسم کا کوئی تباہ حال بھائی تمہارے سامنے آئے اور تمہاری آنکھ دوسری سمت پھرنے کا ارادہ کرے تو اسے کہکر سمجھایا کرو کہ ۔۔۔ ذرا دیکھ تو سہی!

یہ گھر جو بہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

ہم پر کیا بیتی!

گذشتہ حوادث میں،

ہم پر کس طرح اچانک مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

ہماری زندگی کا اثاثہ کس طرح ہمارے سامنے لٹا۔

ہمارے بچے کس طرح ہماری آنکھوں کے سامنے ذبح ہوئے۔

ہمارے بوڑھے بزرگ کس بیکسی کی حالت میں قتل کئے گئے۔

ہم نے جدا ہوتے وقت ایک دوسرے کو کن حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

ہم خانماں برباد کہاں کہاں پھرے اور کہاں کہاں کے دھکے کھا کر کسی گوشۂ عافیت میں پہنچے (اور پھر وہاں اپنوں نے ہم سے کیا کیا)۔

غرضیکہ وہ جو سنا کرتے تھے کہ ؎

خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے — قفس کے سامنے جلتا تھا آشیاں اپنا

اس خواب بد کو کس طرح ہم نے مشہود پیکروں میں اپنے سامنے دیکھا۔

یہ سب کچھ آپ کے ذہن میں تو محفوظ ہے، لیکن آپ کے بچوں کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکیگا۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد خود آپ کا ذہن بھی اس تلخ یاد کو بھلا دینے کی کوشش کرے۔

اس داستان الم کو محفوظ رکھنے اور آگے منتقل کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہماری آنے والی نسلوں کو اس حقیقت کا احساس رہے کہ

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے — ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

اور انہیں یہ بھی معلوم رہے کہ جس وقت ہم پر یہ سب کچھ بیت رہا تھا تو ہمارے وہ چارہ ساز جو قوم کے غم میں کلیجہ تھام کر ملے ملے پھرا کرتے تھے، کس طرح ہماری بربادیوں کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

اسے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے اور اس کا طریق یہ ہے کہ "آپ پر جو کچھ بیتی" اسے بے کم و کاست لکھ کر ہمیں بھیج دیجئے۔ طلوعِ اسلام میں یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اور پھر اسے عند الضرورت بچا کر دیا جائے گا۔

وکالتِ حق و صداقت

پراپیگنڈا!

یعنی وہ فنِ شریف جس کی بنیاد اس دعوے پر ہے کہ جھوٹ کو سو مرتبہ دہرائیے وہ سچ بن کر دکھائی دیگا۔ اقوامِ مغرب کا سب سے بڑا موثر حربہ یہی ابلیسانہ فریب کاری ہے، اور ان کے شاگردانِ رشید، مملکتِ ہندیہ کے اربابِ سیاست کے ترکش کا سب سے زیادہ کارگر تیر یہی دروغ بافانہ عیاری۔ دجل و فریب اور کذب و فسوں سازی کے یہی وہ "رسیوں کے سانپ" تھے جن کی پٹاری یہ جادوگرانِ عہد حاضر، سر خیل شیخ عبداللہ کاشمیری کے سر پر رکھ کر، اقوامِ متحدہ کی "عدالتِ عالیہ" میں بغرضِ نگاہ فریبی پہنچے۔ اس جزم و یقین کے ساتھ کہ حق، باطل کی ان غوغا آرائیوں اور جھوٹ کی ان ملمع سازیوں کے نیچے دب کر رہ جائیگا اور وہ سرزمینِ کشمیر کی ڈگری لے کر فاتح و منصور واپس لوٹیں گے۔

لیکن حُسنِ اتفاق سے پاکستان کو ایک ایسا قابل وکیل مل گیا جس نے اس کے حق و صداقت پر مبنی دعوے کو اس انداز سے پیش کیا کہ اس کے دلائل و براہین عصائے موسوی بن کر رسیوں کے ان تمام سانپوں کو نگل گئے اور ایک دنیا نے دیکھ لیا کہ ان الباطل کان زھوقا، باطل بنا ہی اس لئے ہوتا ہے کہ حق کے مقابلہ میں میدان چھوڑ کر بھاگ جائے۔

ہم پاکستان کو اس عدیم النظیر کامیابی پر مستحق ہزار تبریک و تہنیت سمجھتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خدائے برحق اسے حق و باطل کے ہر معرکہ میں کامیابی عطا کرے اور اس کے دشمن، اس طرح خاسر و نامراد واپس لوٹا کریں کہ شریفوں کی مجلس میں پھر منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۲/۱۱۴)

اُن کے لئے دنیا میں رسوائیاں ہیں اور آخرت میں بہت بڑا عذاب۔

لمعات

طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں ہم نے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے مستقبل سے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ہمیں معلوم ہے کہ وہاں ان کی ملّی زندگی کا شیرازہ بکھیرنے اور ان کی ہیئتِ اجتماعیہ کو منتشر کرنے کے لئے سب کچھ کیا جائے گا اور اس ضمن میں انھیں بہت سی صعوبات و مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ پرچہ ابھی پریس سے باہر بھی نہ آیا تھا کہ اس خدشہ کے عملی آثار فضائے ہند میں لرزہ انگیز دکھائی دینے لگے۔ مہاتما گاندھی کے قتل کے سلسلہ میں راشٹریہ سیوک سنگھ کو خلافِ قانون قرار دیا گیا اور اس کے ان اولین و متعلقین کی گرفتاریاں شروع ہوگئیں جن کے ہاتھ لاکھوں بے گناہوں کے خون سے رنگین تھے اور جن کے فولادی پنجے، سیواجی کی تقلید میں، خود اس سینے میں بھی پیوست ہو چکے تھے جو ابھی چند روز پہلے، انھیں مسلمانوں کے قتل و غارت گری کے جرم سے معصوم قرار دینے میں اُن کے لئے سپر بن چکا تھا۔[1]

مسلمانوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان کے ساتھ ہی مسلم لیگ نیشنل گارڈز کو بھی خلافِ قانون قرار دیدیا گیا اور صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ ان احکامات کے صدور کے ساتھ ہی دھڑا دھڑ ان کی گرفتاریاں بھی شروع ہوگئیں۔ عدل و انصاف سرنگوں اور حق و راستی انگشت بدنداں تھے کہ بالآخر ان بیچاروں کو کس جرم کی پاداش میں حوالہ قید و بند کیا جا رہا ہے۔ ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ انتظامی مصالح کا تقاضا تھا کہ

---

[1] مشرقی پنجاب اور دہلی وغیرہ میں مسلمانوں کے قتلِ عام کے سلسلہ میں جب ہر طرف سے شور اٹھ رہا تھا کہ یہ سب کچھ راشٹریہ سیوک سنگھ اور اسی قبیل کی دوسری جماعتوں کی طرف سے ہو رہا ہے تو اس وقت خود مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ سنگھ کے ذمہ دار افراد سے مل کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ تو سیوا سمتی کی قسم کی خدمت کرنے والوں کی سوسائٹی ہے۔ یہ قتل و غارت گری سے کچھ واسطہ نہیں۔

وہاں کسی فرقہ وارانہ جماعتِ رضاکاران کو قائم نہ رہنے دیا جائے لیکن گرفتاریاں تو ان ہی کی ہو سکتی تھیں جو اس حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایسی جماعت کے قیام پر مصر ہوتے۔ ان بے چاروں نے تو کہیں بھی خلاف ورزیٔ قانون نہیں کی۔ دنیا نے آئین و ضابطہ کے نام پر آئین و قانون کی اس طرح مٹی پلید ہوتے بھی کم دیکھی ہوگی کہ کل تک جو جماعت آئین کے مطابق تھی، اسے آج صبح سے خلافِ قانون قرار دیا جائے اور جو کل تک اس کے رکن تھے انھیں اس جرم کی پاداش میں کہ جب جماعت خلافِ قانون نہ تھی تو وہ اس کے رکن کیوں تھے، کال کوٹھڑی میں بند کر دیا جائے۔ کہا جا سکتا ہے کہ جب ان گرفتار شدگان کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ ہو سکا تو انھیں رہا کر دیا جائے گا لیکن سعدی کی نگہ جہاں بیں نے جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا اُسے کس طرح فراموش کیا جا سکتا ہے کہ کسی جنگل میں دیکھا گیا کہ ایک لومڑی بدحواس اور سراسیمہ اِدھر سے اُدھر بھاگ رہی ہے۔ پوچھا گیا کہ اس وحشت و سراسیمگی کا سبب کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے سُنا ہے کہ بادشاہ کے ملازم اونٹوں کو بے گار میں پکڑ رہے ہیں۔ پوچھنے والے نے سن کر کہا کہ وہ اونٹوں کو پکڑ رہے ہیں تو تمہیں اس سے کیا خطرہ! اس نے کہا کہ تم اسے کیا سمجھو۔ اگر کسی نے مجھے اونٹ بچہ کے شبہ میں پکڑ لیا تو جب تک یہ ثابت ہوگا کہ میں اونٹ بچہ نہیں، لومڑی ہوں، اُس وقت تک میرا چہلم بھی ہو چکا ہوگا۔

ہندوستان کی عدالتوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیشِ نظر لومڑی کو اونٹ کہہ کر ذبح کر دینا نہ مستبعد ہے نہ موجبِ استعجاب۔ اور ہمارا تو خیال یہ ہے کہ چند دنوں کے شور و شیون کے بعد، راشٹریہ سیوک سنگھ کسی اور نقاب میں وجود پذیر ہو جائے گا اور مسلم لیگ نیشنل گارڈز کی ہستی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ یہ خطرہ محض موہوم و مزعوم نہیں، بلکہ قرائن اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ راشٹریہ سیوک سنگھ چونکہ مہاسبھا ہی کی ایک شاخ کا نام ہے اس لئے، وہاں کی مرتعش فضا میں قدرے سکون پیدا کرنے کے لئے، مہاسبھا نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنی سیاسی جدوجہد کو کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر دے اور اپنی تمام تگ و تاز "ہندوؤں کی تنظیم" کے لئے وقف کر دے (گویا ہندوؤں کی تنظیم سیاسی عوامل میں سے نہیں بلکہ خالص "ادبی" مشغلہ ہے)۔ اس فیصلہ پر تبصرہ

کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز اپنی اشاعت مورخہ ۳ فروری کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس باب میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ ہندو مہاسبھا کے اس فیصلہ کے بعد کہ وہ اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر ختم کر دے، اب مسلم لیگ (اور اسی قسم کی دیگر فرقہ وارانہ جماعتیں بھی) مہاسبھا کی تقلید میں اپنے آپ کو ختم کر دیں گی۔ یہی وہ نتیجہ ہے جس کے لئے ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی اور ان کے رفقائے کار بے تابی سے متمنی ہیں۔

غور فرمایا آپ نے کہ ہندو مہاسبھا کی رضاکارانہ تحلیل کا فیصلہ کس غرض سے کیا جا رہا ہے؟ اس غرض سے کہ اس طرح ہندوستان سے مسلم لیگ کے وجود کو ختم کر دینے کے لئے وجہ جواز مل جائے گی۔ بعینہٖ جس طرح راشٹریہ سیوک سنگھ کے خلاف قانون قرار دینے سے، مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے خلاف قانون قرار دینے اور اس طرح ان کی ہستی کو فنا کر دینے کا بہانہ تراش لیا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد، ہندوستان کے مختلف صوبوں میں خود مسلمانوں نے مسلم لیگ کو توڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے بعض جگہ ڈر کے مارے اور بعض جگہ بطورِ احتجاج۔ حالانکہ مہاسبھا نے اپنی سیاسی سرگرمیاں بالکل ترک نہیں کر دیں بلکہ انھیں ملتوی کر دیا ہے۔ مسٹر بھوپٹکر صدر آل انڈیا ہندو مہاسبھا نے اسی فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اخباری نمائندوں کو یہ بیان دیا کہ وہ آئندہ انتخابات کے لئے تیاری کر رہے ہیں۔

ہم نے ان تمام خطرات (بلکہ ان سے بھی اشد صعوبات و مشکلات) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کا مقابلہ، ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے ایمانِ محکم اور عزمِ راسخ سے ہو سکے گا اور کسی طرح سے بھی نہیں ہو سکے گا۔ لیکن شرم و ندامت سے ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں اور مستقبل کے بھیانک تصور سے ہماری روح میں تھرتھری پیدا ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں کے مسلمانوں نے بالعموم کس درجہ تزلزلِ ایمان اور تزعزعِ یقین کا ثبوت دینا شروع کر دیا ہے۔ قومیں دشمنوں کی قوت سے کبھی فنا نہیں ہوا کرتیں، وہ فنا ہوتی ہیں خود اپنے ضعفِ خودی اور عدمِ یقین سے۔

جانے کہ بخشند دیگر نگیرند آدم بمیرد از بے یقینی

دشمن کی قوت سے وہ عارضی طور پر مغلوب ہو سکتی ہیں، مفتوح ہو سکتی ہیں، محکوم ہو سکتی ہیں لیکن اگر ان کے سینہ میں اپنے ملی تشخص کے بقا کی تمنا، اپنے تصوراتِ زندگی کے استبقا کی آرزو، دنیا میں زندہ رہنے اور آبرو مندانہ حیثیت سے زندہ رہنے کی خواہش موجود ہے، اگر انھیں اپنے مستقبل کی درخشندگی پر یقین ہے، اگر اس حقیقت پر ان کا ایمان ہے کہ ان کا وجود صفحۂ دہر پر حرفِ مکرر نہیں بلکہ ——

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما —— تو دشمن کا عارضی غلبہ و تسلط انھیں کسی صورت میں بھی مرعوب نہیں کر سکتا بلکہ اس سے ان کے سینے کے اندر دبی ہوئی چنگاریاں اور بھی بھڑک اٹھتی ہیں اور وہ غیرت و حمیت کی ایک لرزہ انگیز جھرجھری سے جھپٹتی ہیں اور اپنے ضیغمی پنجوں سے فریقِ غالب کی گردن مروڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ ہمارا خیال تھا —— اور کس قدر خوش آئند تھا یہ خیال —— کہ دس برس کی تلاطم خیزیوں اور گذشتہ حوادث و نوازل کی صعب انگیزیوں سے ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ ایمان کہ

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے　　　اس کی اذانوں سے فاش، سرِ کلیمؑ و خلیلؑ

محکم سے محکم تر ہو چکا ہے اس لئے تقسیمِ ہند کے بعد، ہندوؤں کی یہ عارضی بالادستی ان میں جذبۂ مرعوبیت نہیں پیدا کرے گی۔ لیکن، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ابھی کسی امتحان و آزمائش کا موقع بھی نہیں آیا اور مسلمانوں نے بالعموم اس قسم کے تخاذل ومہانت، ایسے تزلزلِ یقین و تذبذبِ ایمان، اور ضعفِ خودی اور تسفلِ نفس کے مظاہرے شروع کر دیئے ہیں جو کسی غیور و باحمیت قوم کے شایانِ شان نہیں۔ کسی انسان یا قوم کے جذبۂ مرعوبیت کی شدت اور پستیٔ اخلاق کی انتہا اس وقت ہوتی ہے جب وہ مداہنت یا تملق (خوشامد) اختیار کرلے۔ جس فرد یا قوم میں غیرتِ نفس اور حمیتِ ذات کی ذرا سی رمق بھی باقی ہو وہ جان تک دیدینا گوارا کرے گی لیکن مداہنت اور خوشامد جیسی ذلیل حرکت پر نہیں اترے گی۔ ہمیں انتہائی قلق اور شدید رنج سے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس باب میں ہندوستان کے مسلمانوں نے بالعموم نہایت مایوس کن روش کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

مہاتما گاندھی کی موت پر انسانیت کا تقاضا تھا کہ ہم اپنی ہمسایہ قوم کے غم میں شریک ہوتے

اور ان سے اظہار ہمدردی کرتے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں نے اس موقع پر بالعموم جو خوشامدانہ طرزِ عمل اختیار کیا ہے اور اس باب میں جو کچھ انھوں نے کیا یا کہا ہے، اس کی توقع شاید ہندو بھی ان سے نہ رکھتے ہوں۔ مثلاً ۵ر فروری کے ہندوستان ٹائمز میں یہ خبر شائع ہوئی۔

دہلی کے مسلمانوں کی خواہش ہے کہ مہاتما گاندھی کے شایانِ شان ایک یادگار قائم کریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی مقدس راکھ میں سے کچھ انہیں بھی دی جائے۔ وہ اس راکھ کا، ہندوستان کی مقدس ترین عمارت جامع مسجد کے قریب، مقبرہ بنائیں گے۔

دہلی بلدیہ کے رکن مسٹر ایس۔ ایم عبداللہ نے کہا ہے کہ گاندھی جی، ہندوستان کی یونین میں مسلمانوں کے تحفظ کے بالخصوص ذمہ دار تھے اور مجھے افسوس ہے کہ ہم (مسلمان) ان کی زندگی میں ان کی کماحقہٗ اتباع نہ کر سکے۔

جامع مسجد کے قرب میں ایک غیر مسلم کی راکھ کا عظیم المرتبت مقبرہ! اور اس پر اظہارِ تاسف کہ گاندھی جی کی زندگی میں مسلمان ان کی کماینبغی اتباع کیوں نہ کر سکے!!

۷ر فروری کے اسٹیٹسمین میں یہ خبر شائع ہوئی۔

گاندھی جی کی وفات کے بعد پہلے جمعہ کو جامع مسجد میں ایک ہزار سے زائد غریب مسلمانوں کو کھانا کھلایا گیا (بدایتاً بغرضِ ایصالِ ثواب! طلوعِ اسلام)۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ تقریب، اسلامی شریعت کے اس حکم کے مطابق منائی گئی جس کی رو سے کنبہ کے عزیز ترین فرد کی موت پر پہلے جمعہ کو غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تقریب ۱۰ دسویں کو بھی منائی جائیگی اور اس کے بعد ۱۲ ر فروری کو بھی جب گاندھی جی کی خاکستر، پریاگ کے مقام پر گنگا، جمنا کے مقدس اتصال میں بہائی جائے گی۔

معلوم ہوا ہے کہ دہلی کے مسلمانوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ۱۲ ر فروری کو مہاتما گاندھی کی راکھ کا جلوس نکالا جائے اور اُسے، جامع مسجد کے سامنے، حضرت ہرے بھرے کے مزار کے متصل دفن کیا جائے۔

۲۰ فروری کے ہندوستان ٹائمز میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی۔

مسلمانانِ ہند نے فیصلہ کیا ہے کہ جامع مسجد کے متصل جہاں گاندھی جی کی مقدس راکھ دفن کی جائے گی، دس لاکھ روپے کے خرچ سے ایک نہایت شاندار مقبرہ تعمیر کیا جائے۔ اس غرض کے لئے، لال قلعہ کے سامنے، ایڈورڈ پارک کے قریب، ایک ہزار مربع گز زمین کا ٹکڑہ حاصل کیا جائے گا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جہاں گاندھی جی کی راکھ دفن کی جائے گی اس پر مسلمانانِ ہند کی طرف سے ایک مقبرہ بھی تعمیر کیا جائے گا۔ اس مقبرہ کی دیواروں پر، چار زبانوں۔ ہندی، اردو عربی اور فارسی — میں گاندھی جی کی تعلیم کو کندہ کیا جائے گا۔ مقبرہ کی عمارت، ہندوؤں اور مسلمانوں کے فنِ تعمیر کا مشترکہ نمونہ ہوگا۔

جمیعت العلماء کے اربابِ بست و کشاد پُرامید ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اس مقبرہ کی تعمیر کے لئے دل کھول کر چندہ دیں گے۔

یہ تو ہوا مقدس راکھ پر مقبرہ تعمیر کرنے کے متعلق۔ جس برگزیدہ ہستی کی یہ مقدس راکھ ہے اس کی شان میں حمد و ثنا کے جو نغمے گائے جا رہے ہیں، ان کی بھی کچھ مثالیں سن لیجئے۔

اخبار صدق کے مدیر، قرآن کے مفسر، جناب عبدالماجد صاحب دریابادی ارشاد فرماتے ہیں۔

گاندھی جی عقیدہ کے لحاظ سے نیم مسلمان ضرور تھے۔ وہ خدا کی وحدانیت اور سرورِ کائنات کے مشن پر اعتقاد رکھتے تھے۔ اور کلام مجید سے ان کو بے حد شغف تھا۔ وہ اسلام کے اصول جمہوریت اور مساوات کے دلدادہ تھے۔ (بحوالہ اخبار جنگ ۲/۲۸ ء)

جی! خدا کی وحدانیت پر اعتقاد رکھتے تھے اور عمر بھر رام اور سیتا[1] (میاں بیوی دونوں) کی پرستش کرتے رہے تھے۔ سرورِ کائنات کے مشن پر ایمان رکھتے تھے اور سرورِ کائنات کے نام پر امت (قوم)

---

[1] گاندھی جی ہر شام جو پرارتھنا کیا کرتے تھے وہ یہ تھی۔

رگھوپتی راگھو راجہ رام۔ پتیت پاون سیتا رام

(رگھو خاندان کے باعثِ فخر، مہاراجہ رام چندر اور ان کی بیوی سیتا، بڑے غریب نواز تھے)

بننے کی مخالفت کرتے تھے۔ کلام مجید سے انھیں شغف تھا اور اردو کی اس لئے مخالفت کرتے تھے کہ وہ "قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے"۔ اسلام کے اصول جمہوریت کے دلدادہ تھے اور انسانوں کی تقسیم وطن کی جغرافیائی حدود کی رو سے کرتے تھے۔ اور یہ "نیم مسلمان" کی تو ایک ہی رہی۔ معلوم نہیں کہ یہ گاندھی جی کی مدح ہوئی یا قدح۔ اس لئے کہ قرآن کی رو سے ایک شخص یا مسلمان ہو سکتا ہے یا غیر مسلم۔ نیم کافر اور نیم مسلمان کا مجموعہ وہی ہے جس کے متعلق قرآن نے فرمایا ہے کہ افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض (۲/۸۵) یعنی کتابِ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان رکھنا اور ایک حصہ سے انکار کرنا۔ اور جس غرض کے لئے اس قسم کی روش اختیار کی جاتی ہے۔ قرآن نے اس کی بھی تشریح فرمادی ہے کہ اولئک الذین اشتروا الحیوٰۃ الدنیا بالاٰخرۃ (۲/۸۶) یعنی یہ روش وہ اختیار کرتے ہیں جن کے پیش نظر خدا پرستی، (حیاتِ اخروی) نہیں ہوتی بلکہ محض دنیاوی مقاصد ہوتے ہیں اور ان مقاصد کے حصول میں اس قسم کی روش ممد و معاون ہوتی ہے۔

خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان اس مداہنت و تملق کی بنا پر گاندھی جی کی تعریف و توصیف میں کس حد تک بڑھ رہے ہیں۔ ۱۵ فروری کے اسٹیٹسمین میں کسی صاحب (اے۔ ایم۔ حسنی) کا خط چھپا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں۔

> مہاتما گاندھی، ایک بہت بڑا ہندو ہونے کے ساتھ ساتھ، اسلام کے نصب العین اور فلسفہ پر بھی پورے اترتے تھے۔

ایک صاحب ہیں عبدالرحمٰن خاں۔ وہ ۱۹ فروری کے ہندوستان ٹائمز میں رقم طراز ہیں۔

> اگر میں یہ عقیدہ نہ رکھتا کہ نبوت، محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ختم ہو گئی ہے تو میں یقیناً گاندھی جی کو بیسویں صدی کا پیغمبر کہتا۔ حضرت مہاتما گاندھی (یہ الفاظ انہی کے ہیں۔ طلوعِ اسلام) ایک ہندو تھے لیکن ان کی ہندو ازم تنگ نظری کی نہیں تھی۔ وہ اپنی تعلیم کو ویدا اور گیتا کی پاکیزہ اور غیر محرف[1] آسمانی وحی سے اخذ کیا کرتے تھے۔ . . . کہئے کہ اگر ہم

---

[1] مدعی سست گواہ چست۔ خود ہندو محققین کے نزدیک بھی ویدا اور گیتا غیر محرف نہیں ہیں۔

اپنے ہیرو اور شہید حضرت مہاتما گاندھی کی اتباع نہ کریں تو اور کس کی اتباع کریں۔

یعنی اگرچہ نبوت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی لیکن اتباع اُن کی نہیں "حضرت مہاتما گاندھی" کی کی جائے گی۔ معلوم نہیں اگر اتباع گاندھی جی کی کرنی ہے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوتِ جاریہ سے فائدہ کیا ہے؟ خیر۔ انھوں نے پھر جھجکتے جھجکتے اور کچھ شرماتے شرماتے کہا ہے۔ ایک صاحب میر مشتاق احمد اُن سے بھی آگے بڑھے ہیں اور انھوں نے برملا کہدیا ہے کہ

گاندھی جی کی عظمت، مکان و زمان کی حدود سے ماورا رہے، یہ محبت و سلامتی کا پیغمبر، اپنی عظمت میں بدھ، عیسیٰؑ اور محمدؐ سے بھی بڑھ گیا ہے۔ (ہندوستان ٹائمز ۱۸ فروری)

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہم نے جس طرح سینہ پر پتھر رکھ کر ان اقتباسات کو درج کیا ہے اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔ ہم نے اس مبحث کو طنزاً نہیں چھیڑا۔ اس سے ہمارے جگر کے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ اس لئے کہ یہ وہ مقیاس ہے جس میں ہم اپنی قوم کی پستی دیکھ رہے ہیں۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں ہمیں ان کی کانپتی ہوئی روحیں، قوت کے سامنے انتہائی تعبد و تذلل سے سجدہ ریز نظر آرہی ہیں۔ مسلمان کا مقام تو خیر بہت بلند ہے۔ اس قسم کی چاپلوسی تو انسانیت کی عام سطح سے بھی گری ہوئی ہے۔ مسلمان، اس قدر ذلیل تو اپنی سلطنت چھن جانے کے بعد، انگریزوں کی عمل داری میں بھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے انگریزوں کے سلاطین کی تعریف ضرور کی۔ ان کے حسنِ انتظام کی مدح و ستائش میں قصیدے بھی لکھے۔ لیکن ان کے مشاہیر و ابطال کو ایسا مرتبہ تو کبھی نہیں دیا۔ بلکہ حق تو یوں ہے کہ عین جس زمانہ میں انگریزوں کا اقتدار مسلط ہو رہا تھا اور مسلمان بری طرح سے کچلے جا رہے تھے، وہی زمانہ تھا جب مسلمان عیسائی مبلغین کے خلاف کھلے بندوں مناظرے اور مباحثے کرتے تھے۔ قادیانی نبوت نے (کہ جو مسلمانوں کی مرعوبیت و قنوطیت کی ایک یاس انگیز تصویر تھی) انگریزوں کو اولی الامر منکم (تم میں سے صاحبانِ اختیار) کہہ کر ان کی اطاعت کو منصوص قرار دینے کی کوشش ضرور کی تھی۔ لیکن وہ تو، خود انہی کے الفاظ میں انگریزوں کا "خود کاشتہ پودا"[1]

---

[1] قومیت پرست مسلمان اسی زمرہ میں شامل ہیں کہ جس غرض کیلئے انگریز نے قادیانی نبوت کو ابھارا تھا اسی مقصد کیلئے ہندو نے ان کی پرورش کی۔

تھی۔ لہٰذا وہ مسلمانوں کی ترجمان نہیں کہلا سکتی۔ اس لئے یہ امر موجب صد تاسف و تعجب ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے شروع ہی میں اس درجہ مداہنت اختیار کر لی۔ اگر یہی لیل و نہار ہیں تو تھوڑے ہی عرصہ کے بعد آپ انھیں زنار پوش و قشقہ برجبیں، اس انداز سے ڈنڈوت کرتے دیکھیں گے کہ ــــ تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری ــــ یہ جو بیسوں باہر سے آنے والی قومیں، آج ڈھونڈے سے بھی کہیں نہیں ملتیں، اور اس اکّال الامم (ہندویت) کا جزو بن چکی ہیں ان کے ساتھ ہی کچھ ہوا تھا۔ انہی کا رام ان کا خدا بن گیا اور انہی کا راون ان کا راکھشس قرار پا گیا۔ اب ان میں اور ان میں کوئی فرق ہی محسوس نہیں ہوتا، حتیٰ کہ انھیں یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کبھی اپنا الگ قومی تشخص بھی رکھتی تھیں۔ یہی ہندو کا مقصد تھا جس کے لئے وہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی اس قدر شدت سے مخالفت کرتا رہا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے جو کچھ اوپر درج کیا ہے وہ چند افراد کے افعال و اعمال ہیں، ہندوستان کے تمام مسلمان ان کے ہم نوا نہیں ہیں۔ ہماری دلی آرزو ہے کہ ایسا ہی ہو۔ لیکن ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کا اس باب میں سکوت بھی کوئی عمدہ شگون نہیں ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کراچی میں بیٹھ کر یہ کچھ کہہ لینا آسان ہے۔ ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعینہٖ یہی چیز ہے جس کی طرف، اس تمام مبحث سے توجہ منعطف کرانا مقصود ہے۔ یعنی یہ کہ نامساعد حالات میں حق گوئی و بے باکی، یہی قوتِ ایمانی ہے۔ ہم نے ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق جب یہ کچھ لکھا ہے تو اس سے یہ مفہوم نہیں کہ پاکستان کے مسلمان قوتِ ایمانی میں اُن سے بہت آگے ہیں۔ یہ وہاں ہوتے تو یہ بھی یہی کچھ کرتے۔ لیکن اس سے اصل حقیقت تو اپنی جگہ رہتی ہے، یعنی یہ کہ کسی قوم کا نامساعد حالات میں تملق پیشگی اختیار کر لینا اور مداہنت پر اتر آنا، اس قوم کی فنا آمادگی کی دلیل ہوتا ہے۔ ہماری اس تنقید سے مقصود ہندوستان کے مسلمانوں کی تنقیص و تحقیر نہیں، ان کی تنقیص خود ہماری تنقیص ہے۔ یہ تو ایک دکھے ہوئے دل کی پکار ہے اور مقصود اس آہ و نالہ سے فقط یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر اس حقیقت کو بالکل واضح اور غیر مستتر کر دیا جائے کہ ان کی زندگی کا راز کس مسلک میں ہے۔ جیسا کہ ہم نے سابقہ اشاعت

میں لکھا تھا، ان کے لئے صحیح راہِ عمل یہی ہے کہ وہ ہندوستان کی حکومت سے رفاہِ عامہ اور فلاح و بہبودِ انسانی کے تمام کاموں میں تعاون کریں۔ امن قائم رکھنے اور فساد مٹانے میں ہر ممکن کوشش کریں۔ شرافت اور دیانت کا ہر وقت پاس رکھیں۔ خواہ مخواہ کی ہنگامہ آرائیوں سے اپنی قوت زائل نہ کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہ اپنی حیاتِ اجتماعیہ کے قیام و بقا میں کوشاں رہیں اور اپنے مخصوص تصوراتِ زندگی کی نگہداشت کریں۔ خوف کو قطعاً پاس نہ پھٹکنے دیں کہ خوف سے بے یقینی پیدا ہوتی ہے اور بے یقینی سے قوموں کی موت واقع ہوتی ہے۔ اپنی خودداری اور حمیت کو کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے نہ جانے دیں کہ باغیرت اور خوددار قوم کو دنیا سے کوئی نہیں مٹا سکتا اور غیرت و حمیت کو بیچ کر زندہ رہنا، ذلت اور لعنت کی زندگی ہے جس سے باعزت موت ہزار درجہ بہتر ہے۔ زندگی صرف سانس لینے کا نام نہیں۔ یہ تو حیوانیت کی پست ترین شکل ہے۔ زندگی غیرت اور عزت کی زندگی کا نام ہے۔ اگر یہ محفوظ ہے تو سب کچھ محفوظ ہے اور اس کے تحفظ کا راز تمہارے ایمانِ محکم اور عزمِ راسخ میں مضمر ہے۔ اپنے عزم و یقین کی کمزوری درحقیقت غیروں کی قوت ہوتی ہے، کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ

جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

اشاعتِ ماسبق میں ہم نے "سندھی اور غیر سندھی" کے دل خراش سوال پر اپنے دلِ دردمند کی چند صداؤں کو اربابِ سندھ تک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ ہمیں توقع تھی کہ اس کے بعد یہ داستانِ الم انگیز ختم ہو جائے گی۔ لیکن افسوس ہے کہ پھر ایسے واقعات منصۂ شہود پر آ گئے جن کی بنا پر ہمیں اس حدیثِ جگر سوز کو اس مرتبہ پھر دہرانا پڑا، جو چند صفحات بعد آپ کی نگاہوں سے گذرے گی۔

ہم ایک دن بازار سے گذر رہے تھے کہ دیکھا کچھ نوجوان جلوس کی شکل میں گذر رہے ہیں، اور نعرے لگا رہے ہیں کہ "سندھ ہمارا ہے"۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اراکین ہیں۔ اس پر کلیجہ سے اک ہوک اٹھی کہ یا اللہ! یہ مسلمان کدھر جا رہے ہیں۔ ہم اپنے ان بھولے نوجوانوں سے گذارش کریں گے کہ آپ اپنی نگاہوں کو اس قدر تنگ کیوں کر رہے ہیں۔ اللہ نے آپ کو بہت

بڑی وسیع زمینوں کا مالک بنا دیا ہے اور آپ ہیں کہ اپنے آپ کو ابھی تک سندھ کی چار دیواری میں محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

کیا آپ کو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ صرف سندھ ہی آپ کا نہیں بلکہ اللہ کے فضل و احسان سے اب تو بلوچستان بھی آپ کا ہے، پنجاب بھی آپ کا ہے، صوبہ سرحد بھی آپ کا ہے اور مشرقی بنگال بھی آپ کا ہے۔ آپ اپنی نگاہوں کو وسعت کیوں نہیں دیتے۔

تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

اللہ آپ کو ایسی وسعتیں عطا کر رہا ہے اور آپ ہیں کہ ابھی تک سندھ کے صحراؤں میں گھرے رہنا چاہتے ہیں۔ ان نادانوں کی غفلت پر غور کیجئے۔ اللہ ان کو آسمانوں کی بلندیوں تک لے جانا چاہتا ہے وَ لٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (پ ۹) اور یہ ہیں کہ زمین کی پستیوں سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں۔

ہم سندھ کے ارباب حل و عقد سے بعجز و الحاح درخواست کریں گے کہ وہ خدارا اس قضیۂ نامرضیہ کو ختم کرانے کی کوشش کریں۔ اگر انھیں مرکزی حکومت کے کسی فیصلے یا ارادے سے اختلاف ہے تو اُسے آئینی طور پر طے کرانے کی سعی کریں۔ اس طرح کی ہنگامہ آرائیاں ہماری سب کی رسوائیوں کا موجب ہیں۔ وفیھا عبرۃ لاولی الالباب۔

اشاعتِ رواں میں، چند صفحات بعد "محاسبۂ نفس" کے عنوان سے جو مقالہ آپ کی نظر سے گذریگا اس میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ قوموں کی زندگی میں صحیح تنقید کو کس قدر اہمیت حاصل ہے اس ضمن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہمارے نزدیک اب مسلم لیگ کی یہ حیثیت ہونی چاہئے کہ وہ حکومت کے عزائم و اعمال پر محتسبانہ نگاہ رکھے اور اس امر کا جائزہ لیتی رہے کہ حکومت پاکستان کا قدم جادۂ حق و صداقت سے ہٹنے نہ پائے۔ وہ مقالہ پریس میں جا چکا تھا کہ خبر آئی کہ لیگ کی کونسل نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کی

تشکیلِ نو میں ارکانِ حکومت، لیگ کے عہدیدار نہ بن سکیں۔ یہ فیصلہ ایسا مبارک اور یہ اقدام اس قدر مستحسن ہے کہ اس پر اظہارِ خیال کو آئندہ اشاعت تک اٹھا رکھنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔

یہ ظاہر ہے کہ پاکستان کی حکومت، قوم کی حکومت ہوگی (اس میں شبہ نہیں کہ ہماری موجودہ حکومت قومی حکومت نہیں کہلا سکتی۔ لیکن یہ محض عبوری دور کے لئے عارضی انتظام ہے۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ پاکستان کے آئینِ جدید میں تشکیلِ حکومت کے لئے جو انداز متعین کیا جائے گا۔ اس کی رو سے حکومت قوم کی صحیح نمائندہ ہوگی۔ اس لئے کہ اگر ایسا نہ ہوگا تو وہ حکومت مستبد آمرانہ ہوگی جو قوم کے لئے غلامی کی بدترین صورت ہوگی) پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ حکومت، چند انسانی دماغوں کے فیصلوں سے ترتیب پاتی ہے اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ حسنِ نیت اور خلوصِ عزائم کے باوجود، انسانی دماغ سے بہرحال غلطی کا امکان ہے اور چونکہ انسان اپنے اعمال پر خود تنقید نہیں کر سکتا، اس لئے اس کے لئے یہ دیکھنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کہاں غلطی کر رہا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ایک کے اعمال کا جائزہ لینے والا کوئی دوسرا ہو۔ اسی کو تنقیدِ صالحہ کہتے ہیں جس کے بغیر کوئی نظامِ حکومت مستحکم و مرتفع نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے دنیاوی نظامِ جمہوریت میں، حزبِ مخالف (Opposition Party) کے وجود کو ناگزیر سمجھا گیا ہے۔ لیکن ان حکومتوں کے حزبِ مخالف، اور قرآنی نظام کی جماعتِ محاسب میں ایک بہت بڑا اصولی فرق ہے۔ ان حکومتوں میں حزبِ مخالف نام ہوتا ہے اُس جماعت کا جو انتخاب میں شکست کھا جانے کی وجہ سے اپنی حکومت مرتب نہ کر سکے۔ اور اکثریت کی قائم کردہ حکومت کے مقابلہ میں، ایک فریقِ مخالف کی حیثیت سے صف آرا ہو جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حکومت، اس فریقِ مخالف کی تنقید و مخالفت کے خوف سے ایسے عزائم و اعمال سے مجتنب رہنے کی کوشش کرتی ہے جس پر انگلی اٹھائی جا سکے اور اس طرح وہ ناقدِ بے زمام نہیں ہونے پاتی۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس اصلاح کا جذبۂ محرکہ تخویف و ترہیب ہو، اس کا نتیجہ آئین و ضوابط کی لفظی پابندی تو ہوتی ہے، شرفِ انسانیت کی بالیدگی نہیں ہو سکتی، ایسے ہی جس طرح خوفِ پاسباں سے، چوری سے اجتناب، شرافت و سعادت کا موجب نہیں بن سکتا۔ قرآن، اس احتساب و تنقید کیلئے

تواصی[1] بالحق کا عدیم النظیر انداز اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یعنی ایک دوسرے کو حق و صداقت پر قائم رہنے کی تلقین کرنا۔ اس اندازِ محاسبہ میں یہ نہیں ہوتا کہ ایک جماعت کا مستقل فریضہ کام کرنا ہو اور دوسری جماعت کا مستقل منصب تنقید و تنقیص۔ نظامِ قرآن میں، جماعت میں تقسیم کار کے ساتھ ساتھ اشتراکِ فرائض بھی رہتا ہے اور جماعت کے ارکان ایک دوسرے کے ممد و معاون اور محاسب و ناقد بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس نظام میں حزبِ حکومت اور حزبِ مخالف، دو الگ الگ مستقل بالذات پارٹیاں نہیں ہوتیں۔ ایک ہی جماعت، تقسیمِ عمل کی رو سے، نظم و نسقِ حکومت کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے اور تبشیر و تنذیر کا بارِ عظیم بھی اٹھاتی ہے۔ اور پھر اس جماعت کے جملہ افراد، ایک دوسرے کے اعمال کا جائزہ بھی لیتے ہیں۔ اور باہمد گر توصیۂ حق و صداقت کا اہم فریضہ بھی ادا کرتے ہیں۔ (ہم اس وقت اس مسئلہ کے متعلق صرف چند اجمالی اشارات پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس کی جزئیات کے متعلق پھر کبھی بحث کریں گے۔ انشاء اللہ)

ہمارے ہاں صورت یہ پیدا ہو رہی تھی کہ حکومت مسلم لیگ کی تشکیل کردہ تھی، لیکن وہی لوگ ارکینِ حکومت تھے اور وہی اربابِ لیگ۔ اس سے خدشہ تھا کہ خود مسلمانوں میں سے ہی ایک اور فریق پیدا ہو جائے جو حزبِ مخالف کی حیثیت اختیار کر جائے اور اس طرح قوم میں تشتت و افتراق کا موجب بنے۔ اسی خدشہ کے پیشِ نظر ہم چاہتے تھے کہ مسلم لیگ اربابِ حکومت کے اعمال و عزائم کے متعلق محتسب و ناقد کی حیثیت اختیار کر سکے۔ تاکہ کسی حزبِ مخالف کی ضرورت باقی نہ رہے۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکتا تھا جب تک تقسیمِ عمل کے اصول کے مطابق، ارکانِ حکومت، اربابِ لیگ سے

---

[1] والعصر ان الانسان لفی خسر۔ الا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات۔ وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔ زمانہ اس حقیقتِ کبریٰ پر شاہد ہے کہ انسان (اپنے عزائم و اعمال کے نتائج میں) زیاں کار رہتا ہے۔ بجز اس جماعت کے جو اپنے ارادوں کی بنیاد خدا (کے قانونِ مکافات) کے ایمان پر رکھے اور ایسے کام کرے جو اس میں زندگی کی سرفرازیوں کی صلاحیت پیدا کر دیں۔ اور ان کا نظامِ عمل یہ ہو کہ) وہ ایک دوسرے کو حق و استقامت کی تلقین کرتے رہیں۔ یہ آیۂ جلیلہ، قوموں کے عروج و زوال اور انسانیت کے ترفع و تسفل کے متعلق ایک عظیم القدر اصول پیش کرتی ہے جس کی تشریح کسی دوسرے موقع پر کی جائے گی۔ (بیدہ التوفیق)

الگ نہ ہوں۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ لیگ کونسل نے اپنے اس فیصلہ سے کہ آئندہ، عمالِ حکومت میں سے کوئی شخص، لیگ کا عہدیدار نہ ہو سکے گا، ایک طرف تشتت و افتراق کے اس خطرہ کو بھی مٹا دیا اور دوسری طرف نظامِ حکومت کی اصلاح و استحکام کی طرف بھی نہایت مبارک قدم اٹھایا۔ لیگ چونکہ ملت کی ترجمان ہے۔ لہٰذا اب، حکومت ملت کے تابع ہوگی نہ کہ ملت حکومت کے تابع۔ اور یہ تبدیلی ایک نہایت خوش آئند اختلاف کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس فیصلہ سے مسلم لیگ کی مسندِ صدارت، قائدِ اعظم جیسی بلند مرتبت ہستی سے محروم ہوگئی لیکن یہ حرماں، محض اصطلاحی ہوگا معنوی نہیں ہوگا۔ لیگ، قوم، قائدِ اعظم کے مشوروں سے بدستور مستفیض ہوتی رہے گی۔

باقی رہی جناب قائدِ اعظم کی ذاتِ گرامی۔ سو ان کی عظمت اس قدر بلند، اور ان کا احترام قلبِ ملت میں اس درجہ گہرا جا چکا ہے کہ وہ مناصب و مدارج سے مشروط نہیں رہا۔ وہ اب اس حقیقت کی مشہود مثال ہیں کہ ـــــ صدر ہر جا کہ نشیند صدر است۔

اب مسلم لیگ کے لئے ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ ہماری دس سالہ جدوجہد میں، لیگ کی حیثیت ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک فریقِ متخاصم سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ صورت یہ تھی کہ ایک نہایت قابل اور دیانتدار وکیل تھا جو دنیا کی عدالت میں، ملتِ اسلامیہ کا مقدمہ لڑ رہا تھا۔ اُسے ضرورت فقط اتنی تھی کہ جب قوم سے، کسی عدالت کی طرف سے پوچھا جائے کہ یہ تمہارا وکیل ہے اور تم نے اسے مختار نامہ دے رکھا ہے تو وہ کہدے کہ بیشک! لہٰذا، اربابِ لیگ کے ذمے، اس سرہلا دینے کے علاوہ، اور کوئی کام نہ تھا۔ بنا بریں لیگ کے مناصب و مدارج کے لئے، معیارِ انتخاب اتنا ہی تھا کہ وہ شخص اتنی مالی حیثیت رکھتا ہے کہ "عدالتوں" میں حاضری کے لئے، خرچہ نہ طلب کرے۔ اس خرچ کے معاوضہ میں جو امتیازی شان مل جاتی تھی وہ یقیناً مہنگی نہ تھی۔ لہٰذا، لیگ کی سیادت و قیادت، ان اربابِ ولت و حشمت کے لئے "بالعموم" ذہنی عیاشی" سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ نہ انھیں عوام سے کوئی ربط تھا نہ ان کے احوال و کوائف کی کچھ خبر۔ نہ ان کے دل میں قوم کا کوئی درد تھا نہ اس درد کے مداوا کی کوئی فکر۔ اقلیت کے

صوبوں میں، پھر بھی ان لوگوں کو، ہندوؤں کی بالادستی کے خلاف، کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اکثریت کے صوبوں میں تو عام طور پر "نوابی ٹھاٹھ" تھا۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ یہ اکابرین، برف کی سلوں کی طرح، ملت کے قوائے عملیہ کو مفلوج کئے ہوئے تھے۔ الحمد للہ کہ پاکستان کے آفتابِ جہانتاب کی حرارت نے ان سلوں کو پگھلا دیا ہے۔ چنانچہ اب، عہدِ کہن کی مسلم لیگ کی زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں۔ اب ہر جگہ، ابتدائی لیگ سے لیکر ہائی کمانڈ تک، نئے انتخابات ہوں گے۔ اب قوم کے لئے وقت ہے کہ وہ اٹھے اور نہایت مناسب اور موزوں شخصیتوں کو منتخب کر کے لیگ کی زمامِ اختیار ان کے ہاتھ میں دے۔ اگر قوم نے اپنی اس ذمہ داری کا احساس کر لیا اور انتخابِ جدید صحیح خطوط پر عمل میں لایا گیا تو لیگ ایک زندہ اور زندگی بخش جماعت بن جائے گی۔ لیکن اگر قوم نے اس باب میں بے اعتنائی اور بے رخی، یا تساہل و تغافل شعاری اختیار کی، تو اس کے بعد، پھر وہی اکاس بیل، ان کے شجرِ ملی پر چھا جائے گی، جس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ درخت کی تمام رطوبتوں کو چوس کر خود سرسبز و شاداب رہتی ہے اور درخت بے چارہ جڑوں تک کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ جدید انتخاب میں، معیارِ فضیلت جوہرِ ذاتی، قوتِ عمل، اور اتباعِ آئینِ خداوندی ہو، نہ کہ قارونیت کی سرمایہ داریاں اور ہامانیت کی دسیسہ کاریاں۔

ہمیں لیگ کے اس فیصلہ سے البتہ اصولی اختلاف ہے کہ لیگ کی تنظیمِ جدید، ایک شخص کے ذمہ ڈال دی جائے۔ چاہیئے تھا کہ اس مقصد کے لئے ایک مجلسِ تنظیمی مرتب کی جاتی تاکہ ان سب کی متحدہ مساعی سے یہ کام جلد از جلد سرانجام پا جاتا۔ کام بہت زیادہ ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ اگر اس میں عجلت برتی گئی تو وہ ادھورا رہ جائے گا اور اگر اس کی تکمیل کی فکر کی گئی تو اس میں بہت زیادہ وقت لگ جائے گا۔ اور دونوں صورتیں بے حد ضرر رساں ہیں۔ بہرحال، اب لیگ کے فعال طبقہ کو چاہیئے کہ از خود آگے بڑھے اور اس تنظیمِ نو کو جلد از جلد بایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ لیگ کی تشکیلِ جدید بھی مجلسِ آئین ساز کی طرح، اصحابِ کہف کا غار بن کر رہ جائے جن کے متعلق فرمایا ہے کہ تحسبھم ایقاظاً وھم رقود (تم سمجھتے ہو کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سو رہے ہیں)۔

خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

مسلمانانِ ہند پر بالعموم اور مسلمانانِ پاکستان پر بالخصوص، علامہ اقبال علیہ الرحمہ کا جس قدر احسان ہے اُس کا ہر قلبِ سلیم اندازہ کرسکتا ہے۔ صدیوں سے مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ

ترس گئے تھے کسی مردِ راہ داں کے لئے۔

اور بیسویں صدی کے اوائل سے تو کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ ۔۔۔ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس آوارگیٔ فکر و نظر اور انتشارِ سعی و عمل کا نتیجہ تھا کہ ان کی کوئی تحریک بارآور اور کوئی حرکت برومند نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے کہ جب کسی راہ رو کے سامنے منزل ہی متعین نہ ہو تو اس کا سفر، سوائے تھکان پیدا کرنے کے اور کیا نتیجہ مرتب کرے گا۔ پریشانی و سراسیمگی کا یہ عالم تھا کہ اس مردِ دانا نے، جسے فطرت کی گہرباریوں نے متاعِ فراستِ ایمانی اور دانشِ نورانی سے نوازا تھا، ان کی بھولی ہوئی منزلوں سے انھیں پھر سے آشکارا کیا۔ کہیں انھیں بتایا کہ ان کے ہاں قومیت کا مدار نسلی اشتراک نہیں بلکہ رشتۂ دین ہے، اس اعتبار سے

خاص ہے ترکیب میں، قومِ رسولِ ہاشمی (۱۹۱۲ء)

کہیں انھیں یاد دلایا کہ جغرافیائی وحدت، انسانوں کی خود ساختہ اصطلاح ہے۔ فطرتِ انسانی سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے (۱۹۰۸ء)

اور اس طرح انھیں ان ستاروں کے نقوش دکھاتے دکھاتے ۱۹۳۰ء میں اُس مقامِ محمود تک لے آئے جو

ان کی جدوجہد کا منتہیٰ اور ان کے سعی دعمل کا قبلہ تھا جہاں انھوں نے فرمایا کہ

مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی سلطنت کا قیام کم ازکم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ (سنہ ۱۹۳۰ء)

یہی تھے وہ نشاناتِ راہ جو مسلمانانِ ہند کی نشاۃِ ثانیہ میں ان کے لئے دلیلِ منزل بنے اور وہ رفتہ رفتہ سنہ ۱۹۴۷ء میں ایک آزاد مملکت کے مالک بن گئے۔ وکذٰلک یحیی اللہ الارض بعد موتہا۔ کہئے کہ کسی قوم پر اس سے بڑا احسان کچھ اور ہو سکتا ہے؟

---

۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۷ء سے پہلے مسلمانانِ ہند دوسروں کی غلامی میں تھے اس لئے وہ اپنے اس محسنِ اعظم کی یاد سوائے انفرادی تقاریب کے اور کسی صورت میں نہیں منا سکتے تھے۔ حصولِ پاکستان کے بعد، سب حساس قلوب کی نگاہیں بابِ حکومت کی طرف لگ رہی تھیں کہ دیکھیں، وہ اب اس بانیٔ تصورِ پاکستان کی یاد کس موزونیت سے مناتی ہے۔ یہ نگاہیں ہر بار، حکومت کے عتبۂ عالیہ تک جاتیں لیکن حسرت بن کر حساس قلوب میں لوٹ آتیں۔ حتیٰ کہ حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ سنہ ۱۹۴۸ء میں کس کس تقریب میں حکومت میں تعطیل منائی جائے گی۔ ان نگاہوں میں تھوڑی سی چمک پیدا ہوئی کہ خیر! اب تو کچھ اشک شوئی کا بہانہ مل جائے گا۔ لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ اس فہرست میں اور سب تقاریب پر تعطیل کا ذکر موجود ہے لیکن اگر موجود نہیں تو اُس کا ذکر جس نے انھیں پاکستان کا تصور عطا کیا تھا!

زگل فروش بنالم کز اہل بازار است تپاکِ گرمیٔ رفتار باغبانم سوخت

تعجب بالائے تعجب کہ اس فہرست میں بسنت پنچمی، شوراتری، ہولی، جنم اشٹمی، دسہرہ، دیوالی، حتیٰ کہ گورو گوبند سنگھ کے یومِ پیدائش تک کی تعطیلات تو موجود ہیں لیکن اقبال کے یومِ وفات کا کہیں ذکر نہیں

اقبال تو اپنے زندگی بخش پیغام کی بنا پر زندہ جاوید ہے۔ وہ اس کا محتاج نہیں کہ اس کی یاد منائی جائے۔ اس کی یاد سے یہ قوم اپنی زندگی اور جذبۂ احسان شناسی کا ثبوت بہم پہنچا سکتی تھی۔ لیکن

افسوس کہ اس نے بڑی احسان فراموشی کا ثبوت دیا!

۲۱ر اپریل کو اقبال کا یوم وفات ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر حکومتِ پاکستان کو اپنی اس فروگذاشت کا احساس ہوگیا ہو تو اس کے کفارہ کی بہترین صورت یہ ہے کہ یومِ اقبال کی تقریب کو سرکاری طور پر منایا جائے اور صرف اسی سال نہیں، بلکہ اس یادگار کو مستقل طور پر قائم رکھا جائے۔ اس سے متصور ہوگا کہ پاکستان کے سامنے وہی نصب العین ہے جسے اقبال نے پیش کیا تھا۔ اور اقبال کا پیش کردہ نصب العین اس کے سوا اور کونسا ہے جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔ فھل من مدکر۔

---

(۳)

حکومتِ پاکستان نے جب اپنے دفاتر کو کراچی منتقل کیا تو ہر چند، دیگر اہم و اشد ضروریات کے پیشِ نظر، عمارات اور ان سے متعلق ساز و سامان پر اخراجات میں انتہائی کفایت کی گئی لیکن بایں ہمہ، دفاتر اور متعلقین دفاتر کی روزمرہ کی ضروریات کے لئے مناسب انتظامات کرنے ہی پڑے۔ دفاتر کے لئے کچھ نہ کچھ عمارات بھی بنوانی پڑیں۔ فرنیچر اور دیگر سامان و یراق کچھ مستعار لیا کچھ خریدا گیا۔ عملہ کی رہائش کے لئے مکانات تعمیر کرانے پڑے۔ دفاتر میں عملہ کے لئے ٹفن روم، موٹروں کے لئے گراج بیرونِ دفاتر کی ضروریات کے لئے ہسپتال، اسکول۔ بڑے بڑے حکام کے لئے کوٹھیاں، بنگلے، کسی نہ کسی طرح مہیا کئے ہی گئے۔ ان سب چیزوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔ لیکن اس اسلامی سلطنت میں مسلمان عملہ کے لئے اگر کسی چیز کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تو وہ مسجد تھی۔ دفاتر کے عملہ میں سے جو "قدامت پرست" اس "زمانۂ تہذیب و تمدن" میں ہنوز عہدِ کہن کی "رسمِ نماز" کی پابندی ضروری سمجھتے تھے انھوں نے کسی کونے اور گوشے میں اپنے لئے سجدگاہ تجویز کرلی۔ جنھیں ایسی جگہ بھی میسر نہ آئی وہ کسی درخت کے سایے میں جا کھڑے ہوئے۔

آپ ظہر کی نماز کے وقت، دفاتر کی ان عالی شان عمارات میں جا نکلئے اور ان کے درخشندہ پس منظر میں، نمازیوں کے اجتماع کو دیکھئے تو فرطِ ندامت سے آپ کی نگاہیں زمین میں گڑ جائیں گی۔ آپ دیکھیں گے کسی درخت کے سائے یا دیوار کی اوٹ میں، چند پتھروں سے ایک احاطہ کی نشان دہی کرلی گئی ہے

اس احاطہ کے اندر، فرشِ خاک پر، چند بوسیدہ چٹائیاں بچھ رہی ہیں اور ان پر یہ متعلقینِ مملکتِ خداداد پاکستان، اپنے رب کے حضور، رکوع و سجود میں مصروف ہیں۔ جن کی پیشانیوں کی خاک اور کپڑوں سے لپٹا ہوا گرد و غبار سنگِ مرمر پر بچھے ہوئے ان قالینوں کی یاد دلا رہا ہے جنھیں ابھی ابھی ان کے جوتے مسل کر آئے ہیں۔ اس شان و شوکت اور تزک و احتشام کو دیکھئے اور پھر اس بے سروسامانی پر نگاہ ڈالئے اور اس کے بعد ـــــ پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے۔

اراکینِ حکومت اور متعلقینِ مملکت کا اجتماعِ جمعہ تو ویسے ہی غائب ہو چکا ہے کہ اس دن نصفِ آخر کے لئے دفاتر بند کر دیئے جاتے ہیں۔ ہفتہ کے دیگر ایام میں جو نمازیں اوقاتِ دفتر میں آجاتی ہیں ان کے لئے یہ "حسنِ انتظام" ہے! دفاتر کی عمارات کے درمیان کئی ایک کشادہ میدان پڑے ہیں جن میں تھوڑی سی توجہ سے، سردست کسی عمارت کے کھڑے کئے بغیر، نمازوں کا اطمینان بخش انتظام ہو سکتا ہے۔ لیکن اربابِ اختیار نے اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی زبانوں سے شریعتِ اسلامی اور قانونِ خداوندی کے تذکرے ہمیشہ زمزم ریز و کوثر بار ہوتے ہیں۔ فھل من مدکر۔

معذرت

سابقہ پرچہ میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ اشاعت زیرِ نظر میں جناب پرویز صاحب کا مقالہ "وراثت ارضی کا ابدی قانون" شائع کیا جائیگا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ عدم گنجایش اس کی اشاعت کی راہ میں حائل ہو گئی۔ ہم قارئین طلوعِ اسلام سے بدل معذرت خواہ ہیں کہ انہیں زحمت کش انتظار ہونا پڑا۔ بتوفیق ایزدی آئندہ پرچہ میں یہ مضمون آپ کے سامنے آجائے گا۔

تقسیمِ ہند کا آئینی پہلو

(قسط اول)

سابقہ اشاعت میں ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک کے واقعات سلسلہ وار بیان کئے گئے ہیں۔ وہ جائزہ بہرنوع ایک سرسری جائزہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں اہم آئینی مسائل پر مفصل تبصرہ کی گنجائش نہیں تھی۔ چونکہ مسائلِ تقسیم اور ان کا آئینی پس منظر تفصیلی بحث کے متقاضی تھے اس لئے عنوان زیرِ نظر خالصتہً اسی موضوع سے مختص ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹۳۶ء میں جو کہا تھا کہ ہندوستان میں دو قوتیں ہیں ایک انگریز کی اور دوسری کانگرس کی۔ تو وہ نعرہ ایک فردِ واحد کی شخصی انانیت کا آئینہ دار نہیں تھا بلکہ اس گہری تبدیلی کا پتہ دے رہا تھا جو اس جماعت میں پیدا ہو چکی تھی جس کا وہ صدر تھا۔ ۱۹۳۶ء کے انتخاباتِ عامہ میں کانگرس جیسی سرمایہ دار اور منظم سیاسی جماعت کی کامیابی یقینی تھی۔ اس کے مقابلہ میں کوئی منظم جماعت نہیں تھی مسلم لیگ ممکن اور مضمر حریف ضرور تھی لیکن انتخابات میں وہ کوئی معین موقف سامنے رکھ کر مسلمانانِ ہند کو مجتمع نہیں کر سکی تھی۔ اس کے دورِ جدید کا آغاز تھا کہ معرکۂ انتخاب آپڑا۔ اس کے باوجود یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ کانگرس کی کامیابی ہندو ووٹوں سے ہوئی، کیونکہ اسے صرف ان صوبوں میں اکثریت حاصل ہوئی جہاں کی آبادی میں ہندوؤں کی عظیم اکثریت تھی۔ اس انتخابی جیت سے وزارتوں کی وہ کرسیاں کانگرسیوں کی دسترس میں آگئیں جن سے ان کی گرفتاریوں کے احکامات صادر ہوا کرتے تھے وہ بالآخران کرسیوں پر متمکن بھی ہو گئے۔ اس تمکن اور قوت نے انھیں بدمست کر دیا۔ چنانچہ کانگرس ایک عوامی جماعت کی بجائے فسطائی جماعت بن گئی اور اپنے اسٹیلر و آمریت کی تشکیل و تعمیر میں منہمک ہو گئی۔

اس ہوسِ استیلا نے سیاسیات میں چند در چند الجھنیں پیدا کر دیں۔ ان الجھنوں کو گذشتہ جنگِ عالمگیر نے اور الجھا دیا۔ چنانچہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہندی کتاب سیاسیات کا آئینی باب ہندوؤں کی طرف سے باطل دعووں اور لاطائل دلیلوں سے سیاہ ہے۔ وہ اس دوران میں کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی چکر میں گھومتے رہے۔ جنگ چھ سال تک جاری رہ کر ممالک و اقوامِ عالم کی بنیادیں زیر و زبر کر کے ختم بھی ہوگئی مگر دنیائے ہند جہاں تھی وہیں کی وہیں رہی۔

صوبائی وزارتوں پر فائز ہو کر کانگرس سرپٹ جا رہی تھی کہ انھیں جنگ نے آلیا۔ برطانیہ نے سب سے پہلے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور جنگ کی طرح ڈالی۔ ہندوستان اس کا محکوم تھا وہ خود بخود متحارب ہوگیا۔ جنگ کے پہلے موسمِ بہار نے عجیب و غریب گل کھلائے۔ یورپی ممالک فرانس سمیت روند ڈالے گئے اور ہٹلر کے الفاظ میں جنگِ یورپ ختم ہوگئی۔ برطانیہ جنگِ یورپ کے جہنم سے برا ستہ ڈنکرک بچ کر نکلا۔ وہ نکل اور بچ تو سکا مگر اس کی بین الاقوامی حیثیت بالکل مخدوش ہوگئی۔ اس کے قدم اس انداز سے اکھڑے تھے کہ سیاسیین نے سلطنتِ برطانیہ کے زوال و خاتمہ سے متعلق سنجیدگی سے گفتگو کرنی شروع کر دی تھی۔

کانگرس برطانیہ کی اس مخدوش حالت سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی اس نے اندازہ کر لیا کہ سودا بازی کا مناسب وقت آگیا ہے اور چونکہ وہ پیشتر ہندوستانی صوبوں کی وزارتوں پر قابض ہے اس لئے لامحالہ وہی انگریز کی جانشین بننے کی حقدار ہے۔ اس اندازے نے اس کے قلب و نگاہ میں بنیادی تبدیلی پیدا کر دی۔ وہ کانگرس اور گاندھی جو اس سے پہلے ہندو مسلم مفاہمت کو آزادی کا پیش خیمہ سمجھتے تھے (یا کم از کم کہا ضرور کرتے تھے) یہ اعلان کرنے لگ گئے کہ ہندو مسلم مسئلہ انگریز کا پیدا کردہ ہے اور بہر نوع ایک خانگی مسئلہ ہے جو آزادی ملنے پر خود بخود حل ہو جائے گا۔ چنانچہ کانگرس کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا کہ مرکز میں فی الفور ایک قومی حکومت کی تشکیل کی جائے جو مرکزی مجلسِ مقننہ کے سامنے جواب دہ ہو۔ اور صوبوں کی نمائندہ حکومتوں کا تعاون حاصل کر سکے۔ یہ مطالبہ جولائی ۱۹۴۰ء میں پیش ہوا جبکہ انگریز یورپ سے پسپا ہو چکا تھا اور وہ یہاں تک سوچ رہا تھا کہ وہ اپنی حکومت کا مرکز لندن سے کسی اور جگہ منتقل کر لے

اور انگلستان کی بجائے اپنی نوآبادیات میں سے کسی ایک کو محاذِ جنگ بنائے اور وہاں سے دشمن کا مقابلہ کرے۔

دسمبر ۱۹۴۱ء میں جب جاپان نے مشرقِ بعید میں اتحادیوں پر حملہ کر دیا اور برق رفتاری سے جزائر بحرالکاہل سے پھلانگتا برما پر بھی قابض ہو گیا تو جنگی نقطۂ نگاہ سے ہندوستان اتحادیوں کے لئے ایک اہم حیثیت کا مالک بن گیا۔ کیونکہ یہی ملک ایک ایسا مستقر بن سکتا تھا جہاں سے جاپان پر دفاعی اور جارحانہ حملے کئے جا سکتے تھے۔ ہندوستان کو جنگی تیاریوں کا مرکز بنانے کے لئے انگریز ضروری سمجھتا تھا کہ اہالیانِ ہند کی ایک حد تک تالیفِ قلوب کرے اور ان کی سیاسی جماعتوں کا تعاون حاصل کر لے تاکہ وہ اندرونی خلفشار سے مطمئن ہو جائے اور یکسوئی سے جنگ لڑ سکے۔ اسی لئے برطانیہ نے ایک ایسی پیش کش کی جو پہلے کی پیش کشوں سے زیادہ دوررس تھی۔ اس پیش کش کے حسن و قبح پر بحث کئے بغیر یہ کہنا پڑتا ہے کہ برطانیہ نے پہلی مرتبہ ہندوستان کا تعاون اس اصل پر حاصل کرنے کی کوشش کی کہ اسے بھی حقیقی سیاسی اختیارات میں شریک کیا جائے۔

انتخاباتِ عامہ میں کانگرس کا کوئی قابلِ ذکر حریف نہیں تھا لیکن حالاتِ مابعدِ انتخابات نے کانگرس کے لئے چند در چند مشکلات پیدا کر دیں۔ اس کا خطرناک حریف مسلم لیگ کی صورت میں نمودار ہوا جس نے بقول قائدِ اعظم محمد علی جناح کانگرس کی نشۂ اقتدار کی بدمستیوں سے متنبہ ہو کر یہ اعلان کیا کہ بساطِ ہند پر ایک تیسری طاقت بھی ہے اور وہ مسلمان کی ہے۔ ان دو سیاسی جماعتوں میں باہمی خلیج وسیع ہوتی گئی جس سے مسلم لیگ مسلمانوں کو مجتمع کرنے میں اور منہمک ہو گئی۔ بالآخر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آل انڈیا نیشنل کانگرس عملاً ایک ہندو جماعت بن کے رہ گئی۔

کانگرس کی آمریت کے مقابل میں مسلم لیگ کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ مستقلاً تقسیم ہند چاہتی ہے لیکن جنگ کے دوران میں مرکزی حکومت میں مساوی نیابت اور ذمہ داری کو قبول کر لے گی بشرطیکہ کوئی ایسا اقدام نہ کیا جائے جو بعد از جنگ تدوینِ آئین اور تشکیلِ پاکستان پر اثر انداز ہو۔ ایک طرف کانگرس کی ہوسِ آمریت اور دوسری طرف مسلم لیگ کی خواہشِ مشارکت، دو متضاد مطالبے تھے۔ کانگرس افہام و تفہیم کی بجائے رفقائے کار کو خود سری سے ٹھکرا کر جملہ اقتدارِ حکومت پوری طرح سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ مسلم لیگ دلائل و

شواہد سے اپنا حقِ زیست منوانا چاہتی تھی۔ ان متضاد داعیات و مطالبات نے بحران پیدا کر دیا۔ جنگ ایسے نازک دور میں داخل ہو چکی تھی کہ انگریز کسی ایک فریق کو ناخوش کر کے اس کا تعاون ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ گیارہ ہندی صوبوں میں سے آٹھ کانگرس کے زیرِ حکومت تھے لیکن مسلمان مسلم لیگ کے مرکز پر جمع ہو کر ہندی سیاست میں ایسی حیثیت اختیار کر چکے تھے کہ انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ فوجی اعتبار سے وہ شمشیر زن بازو تھے۔ اس حقیقت کا انکار و بطلان ناممکن تھا۔

اندرونِ ہند یہ حالت تھی اور بیرونِ ہند جنگ کے لپکتے شعلے سرحدوں کو ہضم کرتے نظر آ رہے تھے انگریز انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ہندوستان کو مضبوط فوجی مرکز بنانے اور اہالیانِ ہند کا تعاون حاصل کرنے کے لئے جنگی کابینہ کے رکن سر سٹیفورڈ کرپس کو معین ہدایات دے کر بھیجا کہ وہ سیاسی جماعتوں اور ان کے قائدین سے گفت و شنید کریں اور انھیں ان تجاویز پر متفق کرائیں۔ کرپس ۲۳ مارچ ۱۹۴۲ء یعنی "یومِ پاکستان" کو دہلی پہنچے۔ رہنماؤں سے ضروری ملاقاتوں کے بعد بالآخر انھوں نے تجاویز کو شائع کر دیا۔

۱۹۴۰ء کی برطانوی پیش کش میں اختتامِ جنگ کے بعد ہندوستان کو نوآبادیاتی درجہ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن اس نئی پیش کش میں برطانیہ اس اقدام کے لئے تیار ہو گیا کہ ہندوستان کو ایسی مقتدرہ بنانے کا اقدام کیا جائے جو اگر چاہے تو دولتِ مشترکہ برطانیہ سے علیحدہ بھی ہو سکے۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ اختتامِ جنگ کے بعد ایک مجلسِ دستور ساز قائم کی جائے گی۔ اس مجلس کا طریق انتخاب جملہ اہم فرقوں کے مابین متفقہ فیصلہ نہ ہونے کی صورت میں، علیٰ قدرِ تناسب نمائندگی کے اصول پر ہوگا اور اسے ان صوبائی مجالسِ مقننہ کے ایوان ہائے زیریں منتخب کریں گے۔ جن کے اس وقت تک انتخابات تو ہو چکے ہوں گے۔ ہندوستانی ریاستوں کو اپنے نمائندے بھیجنے کی دعوت دی جائے گی اور ان کی نیابت ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق ہوگی۔

حکومت برطانیہ اس طرح کے مسودہ قانون کو دو شرائط پر منظور کر کے نافذ العمل کرنے پر آمادگی کا اظہار کرتی تھی۔ پہلی شرط یہ کہ اگر کوئی صوبہ یا صوبے اس آئین کو تسلیم نہ کریں تو وہ براہِ راست برطانیہ سے

تعلق استوار کرنے اور اسی طریق سے اپنا علیحدہ آئین مرتب کرنے کے مستحق ہوں گے۔ ان کا درجہ ہندی یونین کے برابر ہوگا۔ ہندی ریاستیں علی ہذا القیاس نئے آئین کو قبول یا مسترد کرنے کی مختار ہوں گی۔ ہر دو حالتوں میں ان کے معاہداتی امور و انتظامات کو گفت و شنید باہمی سے طے کیا جائے گا۔

دوسری شرط یہ کہ برطانیہ اور مجلس دستور ساز میں ایک معاہدہ طے ہوگا جو ان تمام امور پر حاوی ہوگا۔ جو انتقالِ اقتدار کا لازمی نتیجہ ہوں گے۔ ان میں خصوصیت سے وہ امور شامل ہوں گے جو حکومت برطانیہ کی ان سابقہ ذمہ داریوں سے متعلق تھے جو نسلی یا مذہبی اقلیتوں کی حفاظت کے سلسلہ میں اس پر عائد ہوتی تھیں۔

پھر یہ کہ برطانیہ تدوین آئینِ نو تک، دفاع ہند کو اپنی عالمگیر جنگی مساعی کا ایک حصہ سمجھتے ہوئے اپنے قبضہ میں رکھے گا۔ لیکن ہندوستان کے عسکری، اخلاقی اور مادی ذرائع کی تنظیم کی ذمہ داری حکومت ہند پر ہوگی جسے وہ اہالیانِ ہند کے تعاون سے نبھائیگی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے حکومت برطانیہ نے خواہش کی، بلکہ اس کی دعوت دی کہ اہم ہندی فرقوں کے زعماء فی الفور اور موثر انداز سے ملک کے، بلکہ دولت مشترکہ اور اقوام متحدہ کے مشوروں میں شریک ہوں۔

ان تجاویز میں برطانیہ نے پہلی مرتبہ اعلانیہ طور پر اپنی حکومت کے کسی جز کو یہ اختیار دیا کہ وہ دولت مشترکہ سے باہر بھی جا سکتا ہے۔ جنگ کے دوران میں جنوبی افریقہ اور آئرلینڈ کے رویہ سے ہر چند یہ ثابت ہو گیا تھا کہ اجزائے دولت مشترکہ حق علیحدگی رکھتے ہیں لیکن برطانیہ نے اس کا اعتراف پہلی مرتبہ کیا۔ یقیناً ہندوستان اس سے زیادہ کچھ نہیں مانگ سکتا تھا۔ اب نہ محض اس کا سیاسی درجہ پہلے کی نسبت بلند ہو رہا تھا بلکہ اسے اس شاہراہ پر ڈالا جا رہا تھا جس پر گامزن ہو کر وہ ہر قسم کی غیر ملکی غلامی سے آزاد ہو سکتا تھا۔

سر سٹیفورڈ کرپس نے ایک اخباری ملاقات میں اس شق کو بالکل غیر مبہم اور واضح کر دیا۔ انہوں نے صاف صاف بتا دیا کہ ہندوستان دولتِ مشترکہ سے نکل کر دنیا کے کسی ملک سے بھی اتحاد پیدا کر سکتا ہے اور چاہے تو دیگر غیر ممالک میں شامل بھی ہو سکتا ہے۔

تدوینِ آئین کے معاملہ میں ہندوستان کو کلی اختیارات دیدیئے گئے۔ کیونکہ یہ کام کلیتہً ہندوستان کے سپرد کر دیا گیا اور ہر قسم کے خارجی اثر کو یک قلم ختم کر دیا گیا۔ ہندوستان کا یہ حق بھی پہلی مرتبہ تسلیم ہوا

ورنہ اب تک حکمتِ عملی یہی رہی تھی کہ آئینِ ہند کی تدوین کی ذمہ داری ہندوستان پر نہیں بلکہ برطانوی پارلیمان پر ہے۔ برطانیہ نے مجلسِ دستور ساز سے معاہدہ کرنے پر اظہارِ رضامندی کرکے اس مجلس کو آزاد مجلس تسلیم کرلیا۔ برطانوی افواج کے متعلق بھی سر کرپس نے وضاحت کردی کہ وہ واپس بلالی جائیں گی اور ہندوستان میں صرف وہی غیر ملکی افواج رہ سکیں گی جن کی اجازت ہندی یونین یا یونینیں دیں گی۔

ہندوستان کے آئینِ نو کے سلسلہ میں یہ ذکر کردینا مناسب ہوگا کہ انگریز کے علاوہ جو آئین واقتدار کا مالک تھا اور اب ان سے دستکش ہو رہا تھا۔ تین نمایاں فریق میدان میں تھے جن کا اثر ناقابلِ رد اور حیثیت ناقابلِ انکار تھی۔ ایک طرف کانگرس تھی جو عنانِ حکومت مکمل طور پر اپنے قبضہ میں لے کر کانگرس راج کے ماتحت باقی فریقوں کو بے چارہ بنادینا چاہتی تھی۔ دوسری طرف مسلم لیگ تھی جو دس کروڑ مسلمانانِ ہند کی واحد نمایندہ سیاسی جماعت کا درجہ حاصل کرچکی تھی۔ وہ کانگرس کی فسطائیانہ آمریت کو ٹھکرا کر آسمانِ ہند کے نیچے بے خانماں مسلمان کے لئے ایک ملی نشیمن کا مطالبہ کررہی تھی۔ یہ دونوں سیاسی جماعتیں اپنے اپنے داعیات پر قائم اور مطالبات پر مصر تھیں۔ تیسرا فریق والیانِ ریاست کا تھا جن کا پیش نہاد بقائے اقتدار ذات کے ماسوا کچھ نہ تھا۔ ان کے سامنے نہ سیاسی تقاضے تھے، نہ ملکی مفادات۔ وہ اب تک انگریز کے سہارے جی رہے تھے بلکہ ان کی سرداری انگریزی عملداری کی مصلحتوں کی رہینِ منت تھی۔ انگریزی اقتدار کے خاتمہ میں وہ اپنی شخصی حکومت کا خاتمہ دیکھ رہے تھے۔ وہ سیاسی گفتگوہائے مصالحت میں سیاسی جماعتوں کے دوش بدوش شریک نہیں تھے لیکن ان کی ہستی ایسی گفتگوؤں کی ناکامی کی بلاواسطہ ذمہ دار ضرور تھی۔

کرپس مشن چونکہ جنگی ضروریات کے تحت آیا تھا اس لئے اس کے پیشِ نظر معاملہ کے دو پہلو تھے ایک ہنگامی اور فوری ضرورت تھی۔ اشد ضرورت تھی کہ ہندوستان کی بے پناہ جنگی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر دشمن کا جواب دیا جائے۔ اس کا "حق خدمت" محض یہی نہیں ہوسکتا تھا کہ مستقبل کی آئین سازی مکمل طور پر ہندوستان کے سپرد کردی جائے۔ اس کے لئے فوری اقدامات کی ضرورت تھی۔ ہندوستان کے باہمی مناقشات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انگریز کی ساری صفات اور خدمات کے

باوجود اس کے دو صد سالہ تعلق نے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان بداعتمادی کی گہری خلیج حائل کر دی تھی۔ اس باہمی بداعتمادی کا نتیجہ تھا کہ انگریز نے جب بھی اصلاحات کی نئی قسط ہندوستان کو دی اُسے ہندوستان نے مشتبہ نظروں سے ہی دیکھا اور اسے ایک سیاسی چال سمجھا۔ یہ بداعتمادی ۱۹۴۲ء میں بدستور موجود تھی۔ چنانچہ کانگرس نے اس پیش کش کو انگریز کی بین الاقوامی کمزوری پر محمول کیا اور اس کے قول پر اعتبار کرنے کی بجائے اس سے تحریری اور قانونی ضمانت طلب کرنی چاہی۔ مثلاً ہنگامی ضروریات کے تحت مرکز میں نئی مجلسِ منتظمہ کی تشکیل لازمی تھی۔ یہ مجلس کانگرس، مسلم لیگ اور دیگر اقلیتوں کے نمایندوں پر مشتمل ہوتی۔ ان کے علاوہ انگریز وائسرائے اور انگریز کمانڈر انچیف بھی اس میں موجود ہوتے اور وائسرائے کی حیثیت ایک رکن کی نہ ہوتی بلکہ اسے اختیار ہوتا کہ وہ چاہے تو مجلس کے فیصلوں کے خلاف بھی فیصلہ دے سکے۔

ہر چند کرپس نے یہ وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ عملاً مجلسِ منتظمہ کی حیثیت ایسی نہیں ہو گی کہ کہ وائسرائے ایک جابر بادشاہ کی طرح اسے نظر انداز کر دے بلکہ وہ اس قسم کی مثالیں قائم کر سکتی ہے کہ بغیر قانونِ ہند بدلے وہ اپنے اختیار میں توسیع اور مرتبہ میں بلندی پیدا کر لے۔ لیکن نظامِ جمہوریت کے عملی تجربہ کے فقدان اور ہوسِ آمریت نے کانگرس کو یہ لفظی وعدے قبول نہ کرنے دیئے۔ وہ قانونی اعتبار سے اپنی حیثیت مستحکم اور ناقابلِ شکست بنانا چاہتی تھی اور یہ دورانِ جنگ میں امرِ محال تھا۔ انگریز اس انقلاب کے لئے تیار نہ تھے کیونکہ اولیں مسئلہ کامیابی سے جنگ لڑنا تھا۔ ایسے میں ہندوستان کے بیچ در بیچ آئین کی تدوین میں منہمک ہو جانے سے جنگی مساعی کو ناقابلِ تلافی صدمہ پہنچنا یقینی تھا۔ جنگ انگریز کے لئے زندگی اور موت کا سوال تھی وہ قدرتی طور پر ادھر سے توجہ نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اسی لئے وہ ہر اس مسئلہ کو بعد از جنگ تک ملتوی کر رہا تھا جسے اس وقت ٹالا جا سکتا تھا اور بعد میں حل کیا جا سکتا تھا۔ کانگرس معاملہ کی نزاکت کا کماحقہ احساس رکھتے ہوئے اس ضد پر قائم رہی کہ اگر ان کا مطالبہ آئین کی تبدیلی سے تسلیم ہو سکتا ہے تو آئین کو فوراً اور ضرور تبدیل کر دیا جائے۔

کانگرس ہندوستان کی جنگی مساعی کو عالمگیر جنگی مساعی کا حصہ تسلیم کرتے ہوئے یہ تو مان گئی کہ

کمانڈر انچیف کا عہدہ بدستور انگریز کے ہاتھ میں رہے لیکن اس نے ذمہ دار ہندوستانی وزیر دفاع کے تقرر کا مطالبہ کیا جو برطانیہ کے نزدیک مخصوص حالات میں قابلِ قبول نہ تھا۔ اس معاملہ میں کرپس نے جو وضاحت کی اور جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اس کی روشنی میں دفاع اور جنگ کی دو عملی کوئی ایسا سنگین اعتراض نہیں رہتا تھا لیکن کانگرس نے جب دیکھا کہ مرکز میں اس کی مکمل آمریت تسلیم نہیں کی جا رہی تو اس نے اس بہانہ سے اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔ اس وقت کے وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ کے الفاظ میں کانگرس کی پالیسی یہ تھی "سب کچھ یا کچھ بھی نہیں" چونکہ اسے سب کچھ نہیں ملا اس لئے اس نے کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا۔

کرپس تجویز کی دورانِ جنگ سے متعلق پیش کش غیر واضح تھی اور باہمی بداعتمادی نے افہام و تفہیم سے اس کے خدو خال ابھرنے نہیں دیئے۔ اعلانِ مذکور میں صرف اسی قدر تحریر تھا کہ حکومتِ برطانیہ چاہتی ہے بلکہ اہم ہندی فرقوں کے نمایندوں کو دعوت دیتی ہے کہ وہ ملک، دولتِ مشترکہ اور اقوامِ متحدہ کے مشوروں میں فوراً اور موثر طریق سے شریک ہوں۔ اس شرکت کی نوعیت پر ہر گروہ کو اعتراض تھا۔ کانگرس کی پوزیشن اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ ریاستوں کے لئے مجلس منتظمہ میں کوئی جگہ نہیں تھی مسلم لیگ کی حیثیت بہر نوع ایک اقلیت کی رہتی اور چونکہ مجلس میں فیصلے کثرتِ رائے سے طے پاتے اس لئے وہ چنداں وقیع نہیں ہو سکتی تھی۔ کانگرس اور لیگ کے علاوہ اس مجلس میں دیگر اقلیتوں کے نمایندے بھی ہوتے۔ تجربہ کی بنا پر کہا جا سکتا تھا کہ وہ نمایندے مسلم لیگ کے موید و حلیف نہ ہوتے۔ ان کی موجودگی سے مسلم لیگ کے ارکان کی حیثیت اور غیر موثر ہو جاتی۔ اور پھر یہ بھی یقین نہیں تھا کہ تمام مسلمان ارکان مسلم لیگ کے ہی نامزدگان ہونگے۔ واقعات نے مسلم لیگ اور مسلمانوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہنے دیا تھا لیکن انگریز اور کانگرس نے ابھی تک مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمایندہ اور با اختیار جماعت تسلیم نہیں کیا تھا۔ کانگرس کے نزدیک وہ گنتی کے ایک دو مسلمان ملتِ اسلامیہ کے نمایندے تھے جو گندے دانوں کی طرح ٹوکرے سے الگ کر دیئے گئے تھے۔ وہ دو آدمیوں کو تو جماعت بھر کے نمایندہ قرار دیتے تھے لیکن ساری جماعت کو جو ان کے خلاف تھی نظر انداز کر دیتے تھے۔ ان کی طرف سے مسلمانوں کی نشستوں پر نام نہاد نیشنلسٹ مسلمانوں کا مسلط کرنا یقینی تھا۔ اس سے مسلم لیگ کی پوزیشن مجلسِ منتظمہ میں صفر کے برابر ہو جاتی —

مسلم لیگ اسے بغیر تحفظات کے قبول نہیں کر سکتی تھی۔ تحفظات اس قسم کے ہو سکتے تھے کہ "فرقہ وارانہ معاملات" میں اسی فرقہ کے ارکان کی رائے کو تسلیم کیا جائے جو ان سے براہِ راست متعلق ہوں لیکن ایسے میں "فرقہ وارانہ معاملات" کی تعریف بجائے خود ایک استخوانِ نزاع بن جاتی۔ مسلم لیگ کا دعویٰ تھا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ لہٰذا اس کے نزدیک اکثر مسائل "فرقہ وارانہ" تھے۔ لیکن کانگرس صرف انہی مسائل کو "فرقہ وارانہ" تسلیم کرتی تھی جو مذہب کی چند رسوم ظاہری سے متعلق تھے۔ مثلاً عبادت وغیرہ۔ ان بنیادی اختلافات کے ہوتے ہوئے کانگرس اور مسلم لیگ کا مساوی اشتراک تو قابلِ فہم تھا لیکن اقلیت اور اکثریت کا تعلق ناقابلِ عمل تھا۔ اس دشواری کا کرپس کی ناکامی میں نمایاں حصہ تھا۔

مقامی طور پر ہندی جماعتوں نے اس دقت کا حل تلاش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ مسٹر ایمری وزیرِ ہند کو یہ طعنہ دینا پڑا کہ "قائدینِ ہند سے ملاقات کرنے کے لئے کرپس تو ہزاروں میل اڑ کر گیا لیکن خود قائدین ایک دوسرے سے ملنے کے لئے چند قدم بھی نہیں بڑھے" اگر وہ سنجیدگی اور دیانتداری سے گفت و شنید کرتے تو تصفیہ کی توقع کی جا سکتی تھی لیکن یہاں یہ مصالحت خواہی یکسر مفقود تھی۔

جنگ کی فوری ضروریات کے علاوہ کرپس کی پیشکش مستقبل کے آئین سے متعلق تھی۔ اس لئے تجویز یہ تھی کہ اختتامِ جنگ پر ایک مجلس دستور ساز کا انتخاب کیا جائے۔ یہ انتخاب صوبائی ایوان ہائے زیریں بہ تناسب نیابت کی بنا پر ہونا قرار دیا گیا۔ صوبائی ایوانوں میں سے چار ایوانوں یعنی بنگال، پنجاب سندھ اور سرحد کو چھوڑ کر باقی سات ایوانوں میں ہندوؤں کی غالب اکثریت تھی کیونکہ ان صوبوں میں مسلمانوں کا تناسب آبادی بہت کم تھا۔ باقی چار صوبوں میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے مقابلہ میں کم تھی۔ پنجاب اور بنگال میں خالص مسلم نشستیں نصف سے بھی کم تھیں۔ گویا ان دو صوبوں میں مسلمان اکثریت آبادی کے مالک ہوتے ہوئے بھی مجلسِ مقننہ میں اقلیت میں تھے۔ سندھ اور سرحد میں ان کا تناسب نصف سے زائد ضرور تھا لیکن ان کے جائز حق سے کافی کم تھا۔ ان صوبوں کی اقلیتیں یوں بھی کافی مؤثر تھیں لیکن ان کو ناجائز پاسنگ دے کر اکثریت کو اقلیت میں بدل دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجلس

دستور ساز جو ان مجالس کی طرف سے منتخب ہوگی اور جس کی تعدادِ ارکان ان مجالس کے مجموعی ارکان کا دسواں حصہ ہوگی اس میں غالب اکثریت ہندوؤں کی ہوگی۔ اس میں بھی لامحالہ مسلمانوں کا تناسب ان کی آبادی کے مقابلہ میں کم ہوگا۔

پھر اس مجلس کے فیصلے کثرتِ رائے سے طے ہوں گے جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان ہر معاملہ میں شکست کھا جائیں گے اور وہ اس اکثریت کے رحم و کرم پر ہوں گے جس کی اقلیت کشی ناقابلِ تردید تھی یہ پوزیشن مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول نہ تھی کیونکہ ان کا تحفظ جداگانہ انتخابات میں تھا جسے سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا گیا تھا۔ حالانکہ مجالسِ مقننہ اور دیگر انتخابی اداروں میں انھیں جداگانہ انتخاب کی رعایت حاصل تھی۔ مجوزہ مجلس دستور ساز کی ترکیب میں یہ رعایت بھی ان سے چھین لی گئی تھی۔

مسلم لیگ اسی پر معترض تھی کہ کانگرس ایک قدم اور آگے بڑھی۔ اس نے ریاستوں کی نشستوں پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہا اور اس خیال سے کہ شاید والیانِ ریاست از خود اس کے چشم و ابرو پر رقص کریں اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ ریاستوں کی طرف سے جو نمائندے آئیں وہ والیانِ ریاست کی طرف سے نامزد نہ ہوں بلکہ عوام کے نمائندے ہوں۔ یہ مطالبہ جمہوری تقاضوں کی تکمیل کی تمنائے بیتاب کا مظہر نہ تھا بلکہ کانگرس کی ہوسِ آمریت کا آئینہ دار تھا۔ وہ اس مجلس میں زیادہ سے زیادہ جی حضوری جمع کرنا چاہتی تھی اور چونکہ ریاستی باشندے بیشتر ہندو تھے اس لئے اس نے یہ مطالبہ کیا تاکہ وہی نمائندے آسکیں جو ہندو ہونے کے علاوہ کانگرس سے تعلق رکھتے ہوں اور اس طرح ان کی ووٹوں میں اضافہ کا باعث ہوں۔ یہ طرزِ انتخاب اور یہ ترکیبِ مجلس، مسلم لیگ کے لئے قابلِ قبول نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ مسلمانوں کی قسمت دستِ غیر میں دینے پر آمادہ نہ تھی۔ یہی اس کا موقف تھا۔ لیکن کانگرس مسلمان کی شاہرگ میں خونیں پنجے گاڑ دینا چاہتی تھی۔ نتیجہ سوائے تعطل کے اور کیا ہو سکتا تھا۔

کانگرس کا شدید اعتراض صوبوں کے حقِ علیحدگی پر تھا۔ صوبوں کو یہ حق دے کر برطانیہ نے مسلم لیگ کی اشک شوئی کی تھی۔ کانگرس اسی کنایہ دا یا پر آپے سے باہر ہوگئی۔ درآنحالیکہ یہ تام نہاد حق مسلم لیگ کو قطعاً ناقابلِ استرداد تھا۔ کیونکہ ساری جیٹی کش کا خمیر اس نظریہ سے اٹھایا گیا تھا کہ ہندوستان ایک ملک ہے

اور ہندوستان کے مختلف النوع، مختلف العقیدہ اور مختلف الخیال باشندے ایک قوم اس منبع سے پھوٹنے والے چشمے شفاف اور پاکیزہ نہیں ہو سکتے تھے۔ کانگرس کو یہی گوارا نہ ہوا کہ اس منبع سے یہ مکدر چشمہ پھوٹے اور مسلم لیگ نے اس لئے اسے ٹھکرا دیا کہ اس کا پانی مغطر اور مصفانہ تھا۔

علیحدگی کا مطالبہ مسلمان قوم کر رہی تھی لیکن یہ حق مسلمان کو نہیں بلکہ صوبوں کو دیا گیا اور ہر چند لفظی طور پر صوبوں کو علیحدگی کا حق دیا گیا لیکن عملاً اسے ناممکن الحصول بنا دیا گیا۔ اس کے لئے جو لائحہ بیان کیا گیا وہ یہ تھا کہ صوبے کی مجلس اس سوال کا فیصلہ کریگی کہ آیا اسے مجوزہ ہندوستانی یونین میں شامل ہونا چاہیے؟ اگر الحاق کے حق میں ساٹھ فیصدی سے کم اکثریت ہو تو اقلیت کو حق ہوگا کہ وہ بالغ رائے دہندگی پر تمام مردوں سے استصواب کا مطالبہ کرے۔ یہ رعایت مسلمانوں کو دی گئی تھی لیکن اسے اس شرط سے مشروط کر کے ناکارہ بنا دیا گیا۔ مسلمان اکثریت کے دو صوبوں میں ساٹھ سے کم اکثریت کی آبادی کے مالک تھے اور ہر صوبے کی مجلس مقننہ میں ان کی نیابت ایسی رکھی گئی تھی کہ وہ ایوان میں اقلیت بن جاتے تھے۔ ان حالات میں اس رعایت کا انھیں کچھ فائدہ نہ تھا۔ بنا بریں ان کا یہ مطالبہ حق بجانب تھا کہ اگر تقسیم کا اصول تسلیم کرنا ہے تو اسے جملہ نتائج و عواقب کے ساتھ دیانتداری سے تسلیم کیا جائے ورنہ اس مذاق کو روا نہ رکھا جائے۔

اس گفتگوئے آئین میں متعلقہ فریق ایک دوسرے کو شکوک سے دیکھتے تھے اور انھوں نے اسی شک کی منفی اساس پر گفتگوئیں کیں اور قلب و نگاہ کو مستبد کام جوئیوں سے پاک نہ کر سکے۔ ایسی فضاء میں پیشکش کا مقبول ہو کر نافذ العمل ہونا از قبیل محالات تھا۔ اس مفاہمت ناپسندی کو برطانیہ کی اس شرط نے اور تقویت دی کہ یہ پیش کش یا تو کاملاً تسلیم کی جائے یا کاملاً مسترد۔ یعنی انگریز کی طرف سے باہمی گفت و شنید کے نتیجہ کے طور میں اصلاح و ترمیم کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی گئی اور انھوں نے اپنے نمائندے کی سعی مصالحت کو محدود و پابند کر دیا۔ اس شرط کی عدم موجودگی سے مفاہمت کے امکانات شاید زیادہ روشن نہ ہوتے لیکن ناکامی کی ایک وجہ ضرور کم ہو جاتی۔ چنانچہ مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ نے اس تحدید کے پیشِ نظر پیشکش کے فوری پہلو سے بحث کرنا غیر ضروری سمجھا کیونکہ مستقل حل ان کے نزدیک قابلِ رد تھا اور اس کے

استرداد کے بعد پیشکش کی دوسری شق سے بحث عبث تھی۔

کرپس کی گفتگوؤں کے دوران میں ہندو امید و یاس اور تشویش و انتظار کے عالم میں تھا۔ اس مشن کی ناکامی سے دل برداشتگی اور مایوسی کی عام لہر دوڑ گئی اور سیاسی اور آئینی تعطل پہلے سے زیادہ لاینحل نظر آنے لگا۔

اگر قائدینِ ہند اس تعطل کو دور کرنے کے لئے تیار نہیں تھے تو عالمگیر قوتیں ساکت و خاموش نہیں بیٹھی تھیں۔ مشرق سے جاپان کا خطرہ دن بدن حقیقی ہوتا جا رہا تھا۔ برما اور جزائر انڈمان کے سقوط کے بعد ہندوستان کے بعض ساحلی شہروں پر جاپانی طیاروں نے بمباری شروع کر دی تھی۔ اس کی گذشتہ فتوحات کے پیشِ نظر ہندوستان پر باقاعدہ حملہ بعید از قیاس نظر نہیں آتا تھا۔ شمال مغرب سے جرمن سیلاب فتوحات کے پیش رو ریلے سرحدوں سے ٹکرانے محسوس ہوتے تھے۔ ہٹلر ایک طرف ماسکو تک پہنچ چکا تھا اور دوسری طرف کاکیشیا کے پہاڑوں سے ہوتا ہوا ایران تک آ چکا تھا۔ خوف و ہراس کے عالم میں جرمنی اور جاپانی فوجیں دہلی میں ملتی نظر آتی تھیں۔ اس طوفانِ بلا میں کانگرس کے لئے زریں موقع تھا۔ انھوں نے اس حسنِ اتفاق پر اعتماد کیا جس سے گاہ طوفان بھی کارِ ناخدائی کرتا ہے اور طغیانِ موج آب بیڑے کو اچھال کر ساحل پر ڈال دیتا ہے۔ ایک طرف ہٹلر تھا۔ آریائی تہذیب کا نقیب، اور دوسری طرف جاپان۔ ہند کی آغوش سے ابھرے، گوتم کا لئے ہوئے بدھ مت کا پروردہ جاپان۔ وہ بھی ہندو کا دھرمی بھائی۔ بعض ہندو کچھ عرصہ سے جاپان سے تعلقات استوار کر کے پان ہندو تحریک کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اب وہ خواب متشکل ہوتا نظر آتا تھا۔ ایک طرف آریائی تہذیب کا نقیب، دوسری طرف بدھ مت کا پیرو، دونوں کو خوش آمدید کہا جانے لگا اور استقبال کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

کرپس کی آمد کو کانگرس نے برطانیہ کی کمزوری سمجھا تھا مگر جب ان کی آمریت تسلیم نہ ہوئی اور برطانیہ ان کی توقعات کے مطابق سپر انداز نہ ہوا تو گاندھی نے رسوائے عالم "ہند چھوڑ دو" نعرہ ایجاد کیا اور برطانیہ کو بغاوت کا رعب دے کر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا۔ ۸ اگست کو کانگرس کمیٹی نے مجلسِ عاملہ کی سفارش پر "ہند چھوڑ دو" کی تجویز منظور کی جس میں مندرجہ ذیل مطالبات پیش کئے گئے تھے:۔

۱۔ حکومتِ برطانیہ، ہند سے دستبردار ہو جائے۔

۲۔ آزادیٔ ہند کا اعلان ہوتے ہی ایک عارضی حکومت مرتب کی جائے جو قابلِ ذکر ہندی عناصر پر مشتمل ہو۔

۳۔ وہ عارضی حکومت مجلسِ دستور ساز کے قیام کی صورت پیدا کرے تاکہ ایک متفقہ آئین تیار کیا جا سکے جو وفاقی ہو اور صوبجات کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دے۔

اس مطالبہ کی عدم منظوری کی صورت میں گاندھی ہندوستان کو "خدایا بدامنی" کے حوالے کر دینے پر مستعد و کمربستہ ہو گئے۔ کانگرس کی "عمومی بغاوت" نے راہنمایانِ کانگرس اور دیگر بیشتر کارکنوں کو جیل میں پہنچا دیا۔ عدم تشدد کا نام ہندوستان کی گلیوں اور بازاروں میں رسوا ہوا۔ دو روزہ شورا شوری کے بعد ہنگامہ فرو ہو گیا اور محفل سونی نظر آنے لگی۔

کانگرس کی عدم موجودگی میں انگریز حکومت کا کاروبار تنہا مسلم لیگ کے سپرد نہیں کرنا چاہتا تھا، حالانکہ مسلم لیگ اس کی مجبوریوں کے پیشِ نظر موجودہ آئین کی حدود میں رہ کر اختیارات کی طلب گار تھی۔ مسلم لیگ کا مطالبہ یہ تھا کہ اگر کانگرس شریکِ حکومت نہ ہو تو لیگ ذمہ داری سے کاروبارِ حکومت چلانے پر تیار ہے اور اگر کانگرس آمادہ بہ تعاون ہو تو وہ اس سے مساویانہ حیثیت سے شرکت کے لئے تیار ہے۔ انگریز اپنی مصلحت کے تحت ایسا نہیں کر رہا تھا۔ وہ غیر نمایندہ اور غیر ذمہ دار افراد کو تو حکومت کا منصرم بنا سکتا تھا لیکن کانگرس کی عدم موجودگی میں مسلم لیگ جیسی سیاسی جماعت کو اختیاراتِ حکومت تفویض کرنے کے لئے رضامند نہ تھا۔ کانگرس پیچھے ہٹ کر اپنی بے راہ رویوں کا غیر جذباتی جائزہ لینے کے لئے تیار نہ تھی۔ لارڈ ویول ایسے فوجی وائسرائے کے آنے سے بزمِ سیاست میں چہل پہل نظر آنے لگی۔ وہ ڈرامائی حیثیت سے لندن گئے اور وہاں اربابِ حکومت سے مل کر ایک نئی تجویز تیار کر کے لائے۔ لارڈ ویول نے ملک معظم کی منظوری سے جون ۱۹۴۵ء میں اعلان کیا:۔

> میں مرکزی اور صوبائی سیاست کے راہنماؤں کو دعوت دے رہا ہوں کہ وہ مجھ سے مل کر مجلسِ منتظمہ کی ترتیب میں صلاح و مشورہ دیں۔ مجوزہ مجلس بڑے فرقوں کی نمایندہ ہو گی اور موجودہ

آئین کی حدود کے اندر رہے گی۔ البتہ وہ ترکیب میں وائسرائے اور کمانڈر انچیف کے علاوہ بالکل ہندی ہوگی۔ . . . . . ملک معظم کی حکومت ایک قدم اور آگے جانا چاہتی ہے۔ اس کی تجویز ہے کہ وہ نوآبادیات کی طرح یہاں بھی ایک ہائی کمشنر مقرر کرے جو برطانیہ کے تجارتی اور دیگر مفادات کی نگہداشت کرے۔

اس عارضی حکومت کی تشکیل کا مستقل آئینی تصفیہ پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ . . . . . میں اور ملک معظم کی حکومت مستقل تصفیہ کی ضرورت سے غافل نہیں۔ ان تجاویز سے اس تصفیہ کو نسبتاً زیادہ سہل الحصول بنانا مقصود ہے۔

مدعوین ۲۵ جون کو شملہ میں جمع ہوں گے۔

اگر کانفرنس بے نتیجہ ثابت ہوئی تو موجودہ مجلسِ منتظمہ جس نے نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں بدستور موجود رہے گی تاآنکہ سیاسی جماعتیں کسی متفق علیہ فیصلہ پر پہنچ جائیں۔

ویول تجاویز عبوری دور سے متعلق تھیں۔ اس میں قائداعظم، مسٹر گاندھی اور صوبائی اسمبلیوں کے موجودہ اور سابق وزرائے اعظم وغیرہم بھی شریک ہوئے۔

یہ کانفرنس ۱۹۴۳ء کی کانفرنسوں سے مختلف فضا میں منعقد ہوئی۔ اب جرمنی شکست کھا چکا تھا اور جاپان کی شکست میں گنتی کے دن رہ گئے تھے۔ انگریز بین الاقوامی سیاست میں اپنا کھویا ہوا وقار پھر حاصل کر چکا تھا۔ کانگرس کی امیدیں جو اس نے ۱۹۴۲ء میں مشرق و مغرب سے وابستہ کر رکھی تھیں مایوسیوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ اس کے راہنما کم و بیش تین سال جیلوں میں رہ کر سیاسی آوارگی سے اکتائے ہوئے تھے۔ جنگ کے نازک دور میں انھوں نے جس غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا اور جو خطرناک طریقِ کار اختیار کیا اس کی وجہ سے ہندی سیاست میں ان کا اپنا ڈنکر بن رہا تھا۔ اب پھر سے گم شدہ متاعِ عزت کو تلاش کرنا تھا۔ لہٰذا جس برطانیہ کو آنکھیں دکھائی جا رہی تھیں اور جس کے خلاف عمومی بغاوت کا اعلان کر دیا گیا تھا اب وقت تھا کہ اس کی خوشامد کی جائے کیونکہ وزارتوں کی کرسیوں پر متمکن ہو کر ہی ملک اور قوم کی نگاہوں میں پھر سے مکرم و محترم بنا جا سکتا تھا۔

شملہ کانفرنس میں مرکزی حکومت کی تشکیل سے متعلق تجویز ہوئی کہ اس میں سورن ہندوؤں اور مسلمانوں کی نیابت یکساں ہو۔ دیگر اقلیتیں علیحدہ طور پر شریک ہوں۔ اس تجویز اور جس انداز سے اس کی تفصیلات پر غور ہوا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت برطانیہ اور کانگرس نے حقایق کا کماحقہ احساس نہیں کیا تھا، یا وہ قصداً حقایق سے آنکھیں بند کئے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کی خوشنودی و تائید حاصل کرنے کے لئے یہ رعایت تو دے دی گئی کہ مسلمان اور سورن ہندو برابر کی تعداد میں ہوں گے۔ نیز اس کی تسلی اور دلجمعی کے لئے یہ اعلان کیا گیا کہ اس عارضی مفاہمت کا مستقل مفاہمت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا لیکن مساواتِ نیابت کو بے کار بنانے کے لئے یہ بیچ لگا دی گئی کہ اچھوتوں، سکھوں اور عیسائیوں وغیرہ کا ایک ایک نمایندہ سورن ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ ہوگا۔ گویا یہ رعایت دے کر یہی کوشش کی گئی کہ حکومت میں مسلمانوں کا تناسب عملاً ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو۔ چنانچہ ۲۹ جون ۱۹۴۵ء کو شملہ میں اخباری نمایندوں کو بیان دیتے ہوئے قائدِ اعظم نے فرمایا۔

> تجویز و پول کی اساس ہندو مسلم مساوات پر ہے لیکن ہمیں اس مساوات سے کوئی خوش یا غلط فہمی نہیں۔ کیونکہ مجوزہ مجلس منتظمہ میں مسلمانوں کا حصہ ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہوگا اور ساری مجلس میں مسلمان ایک تہائی کی اقلیت میں رہیں گے۔ ہندوؤں کی تعداد (بظاہر) مسلمانوں کے برابر ہوگی لیکن اچھوت اس پر مستزاد ہوں گے۔ نیز سکھوں کو بھی نمایندگی حاصل ہوگی اور ہم ابھی یہ نہیں جانتے کہ اور کونسا فرقہ یا فرقے حق نمایندگی حاصل کرلیں گے . . .
>
> اندریں حالات مجلس کی مخصوص ہیئتِ ترکیب کے پیشِ نظر اکثریت کانگرس کی ہوگی اور اس امر کی کوئی خاطر خواہ ضمانت نہیں ہے کہ کانگرس کثرتِ رائے سے مسلمانوں کے خلاف فیصلے صادر نہیں کرلیا کریگی۔

ایسی فضا میں کسی مفاہمت کی توقع بے کار ہوتی ہے چنانچہ یہ کوشش بھی ناکام ہوئی۔ مسلمانوں کا زور توڑنے اور ان کی قوتِ رائے کو غیر وقیع بنانے کے لئے کانگرس نے اپنے علاوہ دیگر غیر مسلم عناصر کی نمایندگی پر زور دیا۔ چنانچہ سکھوں، عیسائیوں اور اچھوتوں تک کے نمایندوں کی گنجایش پیدا کرلی گئی۔ اور اسی پر

اکتفا نہیں کی گئی بلکہ خود مسلمانوں کے حصہ پر بھی ہاتھ صاف کرنے کی کوشش ہوئی اور کانگرس نے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کی پانچ نشستوں میں سے کم از کم دو کے لئے کانگرسی مسلمان نامزد ہوں۔ مسلمانوں کے حصہ پر ایک حملہ پنجاب سے کرایا گیا۔ سر خضر حیات پنجاب کے وزیرِ اعظم بطور وزیرِ اعظم شریک کانفرنس ہوئے تھے۔ لیکن لارڈ ویول اور گورنر گلینسی کی مصلحتوں نے ایک مسلمان نشست ان کے سپرد کردی۔ یہ اقدام سراسر غیر آئینی تھا۔ خضر حیات نام نہاد یونینسٹ پارٹی کے لیڈر تھے جو معجون مرکب تھی۔ وہ ایک سیاسی پارٹی کہلانے کی قطعاً مستحق نہ تھی۔ اگر بغرض استدلال اسے ایک سیاسی پارٹی تسلیم بھی کرلیا جاتا تو وہ پنجاب اسمبلی کے اندر اپنا وجود رکھتی تھی اور اس کے باہر صوبہ میں وہ ایک مردہ جماعت تھی۔ پھر خضر حیات کی شمولیت اس پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے نہ تھی اس پارٹی کو بہ حیثیت پارٹی دعوت ہی نہیں دی گئی تھی خضر حیات بالکل اسی طرح کانفرنس میں شریک ہوئے تھے جس طرح دیگر صوبوں کے وزرائے اعظم۔ لیکن تعجب ہے کہ کسی اور وزیرِ اعظم کو تو یہ حق نہیں دیا گیا لیکن پنجاب کے وزیرِ اعظم کو ایک نمایندہ اور وہ بھی مسلمانوں کے مقررہ حصہ میں سے دینے کا حق دیا گیا۔ اب سوائے اس کے کہ مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ کے نام سے موسوم کیا جائے اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ ایسی فضا میں مسلمانوں کا تعاون کیسے حاصل ہوسکتا تھا؟

یہاں ضمناً یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جن آئینی مذاکرات کا ہم جائزہ لے رہے ہیں ان میں مسلمانوں کی ضد میں دیگر اقلیتوں کو غیر ضروری اہمیت دیدی گئی۔ کانگرس نے مسلمانوں کے مقابلہ میں سکھوں کو بڑھایا اور ان کے لئے ایک علیحدہ نشست حاصل کرنے کی سعی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نام نہاد دیگر اقلیتیں آئندہ مذاکرات میں متعلقہ فریق کی حیثیت اختیار کرگئیں۔ ہرچند ان میں سے ابھی تک صرف سکھوں کی حیثیت باقاعدہ طور پر مسلم ہوئی ہے اور باقی اس درجہ تک نہیں پہنچ سکے۔ لیکن سکھوں کو یوں بانس پر چڑھانے سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں اور ابھی ہندوؤں کو اپنے طور پر نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ جس طرح آئینی مذاکرات میں سکھوں کو بڑھایا گیا بعینہٖ ہندوؤں نے سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا اور تقسیم کے بعد کے مسلمانوں کے قتل عام میں وہ ان کے آلۂ کار بنے۔ وہ وقت دور نہیں جبکہ ہندو اس خطرناک غلطی کو محسوس کرلیں گے جس کا ارتکاب انھوں نے محض مسلمانوں کی ضد

میں آ کر کیا۔ شاید اس وقت اس کی تلافی ممکن نہ ہو۔

خیر، یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اس تیرِ از کماں رفتہ سے متعلق قیاس آرائیاں ہمارے حیطۂ مضمون سے خارج ہیں۔ ہم ذکر کر رہے تھے کہ شملہ کانفرنس کی تعمیر میں ہی ایسی خرابی کی صورت مضمر تھی کہ وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ چنانچہ جب راہنماؤں کی مشترکہ کانفرنس بے نتیجہ ثابت ہوئی اور وہ مجلسِ منتظمہ کی تشکیل و ترکیب پر اتفاق نہ کر سکے تو لارڈ ویول نے کانگریس اور مسلم لیگ کو دعوت دی کہ وہ اپنے اپنے نامزدگان کی فہرستیں دیں تاکہ وائسرائے ازخود ان میں سے انتخاب کر لے۔ کانگریس نے جو فہرست داخل کی اس میں کانگریس کے علاوہ مسلم لیگی قائدین کے نام بھی موجود تھے۔ حالانکہ اس کا دائرۂ انتخاب اپنی جماعت تک محدود تھا۔ ادھر مسلم لیگ نے مطلوبہ فہرست دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اسے محولہ بالا اعتراضات کے علاوہ ایک یہ اعتراض بھی تھا کہ ارکان مجلس منتظمہ کے فرائض و تقسیم شعبہ جات سے متعلق کوئی اندازہ نہیں بتایا گیا تھا۔ وائسرائے اس تعین کو آئندہ پر چھوڑنا چاہتے تھے۔ اور مسلم لیگ پہلے سے یہ ضمانت لینا چاہتی تھی کہ مجلس میں اس کی موجودگی برائے نام نہیں ہوگی اور اس کے پاس بھی اہم شعبے ہوں گے۔ مسلم لیگ کے اس انکار کے بعد کانگریس نے موقع غنیمت سمجھا اور وائسرائے پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ مسلم لیگ کے بغیر تنہا کانگریس کو اختیاراتِ حکومت سونپ دیں۔ کانگریس البتہ مسلم لیگ کے لئے دروازہ کھلا رکھے گی اور وہ جب بھی چاہے — کانگریس کی عائد کردہ شرطوں پر؟ — شریک حکومت ہو سکیگی۔ گاندھی اور نہرو کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود انگریز نے اس سودا بازی سے اجتناب کیا۔

وائسرائے اور قائدین شملہ کی بلندیوں سے اتر کر پھر دہلی کے میدانوں میں آ گئے۔ پھر وہی تعطل!

مسلم لیگ پر عموماً مخالفین کی طرف سے یہ اعتراض ہوتا چلا آ رہا تھا کہ وہ مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت نہیں۔ جنگ کے دوران کی سیاست میں کانگریس اسی ضد پر اڑی رہی کہ وہی جملہ اقوام و اہالیانِ ہند کی خصوصی ترجمان ہے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے ایک حصہ کی ترجمان ضرور ہے لیکن مسلمانوں کا قابلِ قدر طبقہ اور عوام کانگریس ہی کے موید ہیں۔ مسلم لیگ اس کے برعکس یہی جتاتی اور ثابت کرتی رہی کہ سیاست ملی کا صحیح آئینہ مسلم لیگ کے علاوہ اور کوئی جماعت نہیں۔ کرپس کی آمد سے لے کر شملہ کانفرنس

کی ناکامی تک یہی مسئلہ لیگ اور کانگرس کے مابین مابہ النزاع رہا کہ مسلمان بہ حیثیتِ مجموعی کس جماعت کے ساتھ ہیں۔ مخالفینِ لیگ اپنے دعوے کے جواز میں یہ فرسودہ دلیل پیش کرتے تھے کہ ۱۹۳۷ء کے انتخاباتِ عامہ میں کانگرس نے مجالسِ مقننہ کی غالب نشستوں پر قبضہ حاصل کر لیا۔ درآنحالیکہ مسلم لیگ صرف گنتی کی نشستیں جیت سکی تھی۔ انتخابات کے نتائج واقعی سیاسی جماعتوں کی مقبولیت اور قوت کے مقیاس ہوتے ہیں مگر ۱۹۳۷ء کے جن انتخابات کا حوالہ دیا جا رہا تھا ان کے نتائج کو بدلتے ہوئے حالات نے اس قدر فرسودہ قرار دیدیا تھا کہ وہ صحیح رائے کی اساس نہیں بن سکتے تھے۔ مخالفینِ لیگ نہایت ڈھٹائی سے ان باطل اعداد و شمار کو دنیا کے سامنے اصرار و تکرار سے پیش کر کے دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونک رہے تھے ۱۹۳۵ء کے قانونِ ہند کے ماتحت جو اولین انتخاباتِ عامہ برپا ہوئے ان میں مسلم لیگ تنظیمی اور پروپیگنڈائی نقطۂ نگاہ سے عہدِ طفولیت میں تھی۔ لیکن انتخابات کے بعد اس نے مسلمانوں کو اس قدر مضبوطی سے اپنے آپ سے وابستہ کر لیا کہ بعد کے ضمنی انتخابات میں اس نے قریباً سو فیصدی کامیابی حاصل کی۔ یہ ضمنی انتخابات بعض ایسے مسلم حلقوں میں منعقد ہوئے جہاں کانگرس کی طاقت ناقابلِ شکست سمجھی جاتی تھی۔ اس کے باوجود مسلم لیگ نے کانگرس کو شکستِ فاش دی، چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ کوئی ساٹھ کے قریب ضمنی انتخابات میں سے کانگرس صرف دو تین جگہ مسلم لیگ کو شکست دے سکی۔ یہ ایسی تبدیلی تھی جس نے ۱۹۳۷ء کے انتخابی نتائج کو باطل کر دیا تھا مگر دشمنوں کی پروپیگنڈہ مشینری بدستور حرکت میں تھی اور انہی پامال راستوں پر جا رہی تھی۔

شملہ کانفرنس کے دورانِ انعقاد میں مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو شدت سے ٹھکرایا گیا۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے مسلمان نشستوں میں سے دو کانگرس ہتیا رہی تھی اور ایک پنجاب کے یونینسٹ وزیرِ اعظم اور یہ لوٹ اس لئے مچ رہی تھی کہ مسلمانانِ ہند کسی مرکزِ واحد سے وابستہ نہیں سمجھے جاتے تھے۔ انہیں صید زبوں سمجھا جا رہا تھا کہ جو جس کے ہاتھ لگا وہ اسی کا ہو گیا۔ قائدِ اعظم نے اس بیہودہ دعویٰ کو یکبارگی ہمیشہ کے لئے باطل کر دینے کے خیال سے برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ جلد از جلد انتخاباتِ نو کریں اور مسلم لیگ کو موقع دیں کہ وہ اپنا دعوئے نمائندگی ثابت کر سکے۔ اس نے کانگرس کو للکارا کہ وہ انتخابی میدان میں آئے اور

پاکستان اور نمائندگیٔ مسلم کے مسئلہ پر لڑکے دیکھ لے۔

انتخابات کا اعلان ہوگیا، کانگرس، اس کے حواری، اس کے کرایہ دار، حشرات الارض کی طرح مقابلہ میں آ ڈٹے۔ ضمنی انتخابات نے جن پروپیگنڈائی اور سیاسی تلواروں کو کند اور ناکارہ بنا دیا تھا وہ صوبائی گورنروں نے اپنی کارگرِ اختیاراتِ خصوصی سے صیقل کر کے دیں۔ یہ تلواریں چمکیں، تڑپیں، ٹوٹیں اور گریں مرکزی اسمبلی سے پہل ہوئی۔ مسلم لیگ نے سو فیصدی کامیابی حاصل کی۔ کئی جگہ مخالفین کی ضمانتیں تک ضبط ہوگئیں۔ صوبوں کی باری آئی، سب بت ایک ایک کر کے خاک ذلت پر جا گرے۔ چار صوبوں میں مسلم لیگ نے سو فیصدی مسلم نشستیں جیتیں۔ صرف سرحد میں اس کی کامیابی پینتالیس فی صدی تھی۔ دیگر صوبوں میں اسی اور نوے فی صدی۔ مجموعی کامیابی نوے پچانوے فیصدی تھی۔ جمہوریت کی ساری تاریخ ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ ایک سیاسی جماعت نے انتخابات میں اتنی عظیم اکثریت حاصل کی ہو اور مخالفین کو اس بری طرح پچھاڑا ہو۔

ہندی انتخاباتِ عامہ سے پہلے جمہوری اور پارلیمانی طرزِ حکومت کا گہوارہ یعنی خود انگلستان اس معرکۂ انتخاب سے دوچار ہو چکا تھا۔ جس نے چرچل جیسے ناقابلِ شکست قائدِ حرب کا ٹاٹ الٹ دیا تھا۔ حزبِ عمال نے انتخاباتِ عمومی میں غیر متوقع اور غیر معمولی کامیابی حاصل کی تھی، اس کا فی صدی تناسب بمشکل ساٹھ تھا۔ خود ساٹھ فی صدی کامیابی حاصل کر کے حکومت پر قابض ہو جانے والے انگلستانی وزراء نے دیکھا کہ مسلم لیگ سو فی صدی کے لگ بھگ کامیابی حاصل کر کے بھی صوبائی وزارتوں سے محروم رکھی گئی۔ یہ سیاساتِ ہند کا دلچسپ معمہ تھا۔ پنجاب کی وزارت اس خصوصیات کو تفویض کی گئی جس کی پارٹی کے ارکان کی تعداد ایک سو چھتیس ارکان کے ایوان میں دس سے زیادہ نہ تھی۔ اس کے مقابلہ میں مسلم لیگ کی وہ پارٹی تھی جس کی قوت اسّی ارکان سے بھی زائد تھی۔

یہ ستم ظریفی، یہ تضاد تا بکے؟ ہار اسی کی جو جیتا!

حکومت عمال کب تک خاموش تماشائی رہتی؟ انتخاب سے پیشتر ایک پارٹی کی حیثیت سے اس نے بلند بانگ دعاوی باندھ رکھے تھے۔ ہر انتخابی مہم کے موقع پر متخالف جماعتیں ایسے ہی دعوے باندھتی ہیں لیکن

جیتنے والی جماعت کو اپنے عہد و پیمان کی کچھ نہ کچھ لاج ضرور رکھنی پڑتی ہے۔ یوں بھی شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد لارڈ ویول وائسرائے ہند نے ملک معظم کی حکومت کی طرف سے ۱۹ ستمبر ۱۹۴۵ء کو یہ اعلان کیا تھا کہ انتخابات کے نتائج نکل آنے پر جتنا جلدی ممکن ہوگا ایک مجلس دستور ساز مرتب کی جائے گی۔ اس کی ترتیب کے لئے وائسرائے مرکزی صوبائی اسمبلیوں اور ریاستی نمائندوں سے گفت و شنید کریں گے اور یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ آیا کرپس تجاویز قابلِ قبول یا قابلِ عمل ہیں یا کسی متبادل یا اصلاح یافتہ تجویز کو ترجیح دی جائے۔

اٹیلی کی حکومت نے بالآخر ہندوستان کی طرف توجہ منعطف کی اور اس سلسلہ کو از سرِ نو شروع کیا جو شملہ تک پہنچ کر ٹوٹ گیا تھا۔ ۱۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو وزیر اعظم برطانیہ نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ کابینہ کے تین وزراء یعنی لارڈ پیتھک لارنس (وزیر ہند) سر سٹیفورڈ کرپس (صدر تجارتی بورڈ) اور مسٹر اے۔ وی الیگزینڈر (وزیر البحر) عنقریب ہندوستان جائیں گے تاکہ وائسرائے اور ذمہ دار سیاسی قائدین کی مدد اور تعاون سے اس ملک کے لئے حکومتِ خود اختیاری کا راستہ صاف کریں۔ مسٹر اٹیلی نے کہا:۔

> میں بخوبی آگاہ ہوں کہ جب میں ہندوستان کا ذکر کرتا ہوں تو میں ایسے ملک کے متعلق بات کرتا ہوں جو نسلوں، زبانوں اور مذاہب کا عجیب و غریب مجموعہ ہے۔ میں ان مشکلات کو اچھی طرح جانتا ہوں جو بدیں وجہ پیدا ہو گئی ہیں لیکن ان مشکلات پر ہندوستانی خود ہی قابو پا سکتے ہیں۔
>
> ہمیں اقلیتوں کے حقوق کا مناسب خیال ہے۔ اقلیتوں کو خوف سے آزاد رہنے کے قابل ہونا چاہئے۔ لیکن ہم اس کے مقابلہ میں اقلیت کو یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ اکثریت کی ترقی میں رکاوٹ بن جائے۔
>
> ہم اپنی طرف سے ان مشکلات کا حل مسلط نہیں کر سکتے۔ ہمارا فرضِ اولین یہ ہے کہ ایسی صورت پیدا کریں جس سے فیصلے ہو سکیں۔
>
> ہم ایک عارضی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تاکہ وائسرائے کو زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو اور اس عرصہ میں کہ آئین کی تدوین ہو رہی ہو ایک ایسی حکومت قائم رہے جسے ہندوستان کی طرف سے زیادہ سے زیادہ تائید حاصل ہو۔

حزبِ عمال جب محض ایک سیاسی پارٹی تھی اور فائز اقتدار کی بجائے اس کا درجہ حزبِ مخالف کا تھا تو پروپیگنڈائی اعتبار سے اس نے بہت سے سبز باغ تخلیق کر رکھے تھے۔ وہ اپنی اشتراکیت کو برطانوی قوم کے علاوہ انسانیت تک کے لئے آبِ حیات سمجھتی تھی۔ لیکن یہ غیر ذمہ دارانہ باتیں وہی افراد یا گروہ کر سکتے ہیں جو کاروبارِ حکومت کی گرانباریوں سے سبکدوش ہوتے ہیں۔ شش سالہ جنگِ عالمگیر نے اقوامِ عالم کے لئے چند در چند مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ انسانیت ابھی تک اس قابوس کے چنگل سے رہا نہیں ہوئی۔ انگلستان جو سلسلہ حرب کی نمایاں کڑی تھا ان مشکلات کا سب سے بڑھ کر شکار رہا۔ اس کا ملکی نظام درہم برہم ہو گیا۔ غیر متوازن و متزلزل اقتصادیات نے مجلسی صائب سے مل کر ایک ہمہ گیر خلفشار پیدا کر دیا تھا۔ ملک کی تباہ حالی، سرمایہ کی دقتیں محنت کی جانفشانیاں، ضروریاتِ زندگی کی کمی قیامت کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ ان غیر معمولی مصائب کے مقابلے کے لئے غیر معمولی فکر، عظیم الشان منصوبہ بندی اور مکمل صلاحیتِ قوی کی اشد ضرورت تھی۔ حزبِ عمال، پروپیگنڈائی غوغا آرائی ایک طرف، چنداں نمایاں اہلیت و استعداد کی مالک نہیں تھی۔ اس میں انتظامی قابلیت کی کمی تھی اور حکومتی تجربہ کا فقدان۔ ان مشکلات میں انھیں اپنی دھاک بٹھانی تھی۔ انگلستان کو اقوامِ عالم کی صفِ اول میں بحال کرنا تھا اور اپنے اشتراکی اعلانات کی لاج رکھ کر ان وعدوں کو پورا کرنا تھا جو اس نے غیر ذمہ داری کے ایام میں غلام و محکوم ہندوستان سے کئے تھے۔ یوں بھی جنگ کے دوران میں آئینی مذاکرات کا جو سرچشمہ پھوٹا تھا اُسے پاٹنا ناممکن تھا نہ اس کی روانی کو روکنا ممکن العمل۔

بین الاقوامی سیاست میں انگلستان کی بحالی آسان کام نہ تھا انھیں خطرہ تھا کہ اگر حزبِ عمال اس میں ناکام رہی تو اندرونی خلفشار اور خارجی حکمتِ عملی کی ناکامی مل کر ان کا ٹاٹ الٹ دیں گے۔ ہندوستان کے قضیۂ نامرضیہ کا حل ضروری تھا لیکن حل اس نہج سے کہ ناکامی کی صورت میں ساری ذمہ داری ہندوستان کے سر تھوپی جا سکے۔ اور کامیابی کی صورت میں اس کارنامے اور کارگزاری کی اندرون و بیرون ملک نمایش کر کے اپنی بحالی اور سربلندی حاصل کی جا سکے۔

وزیرِ اعظم برطانیہ کا بیان اسی کشمکش کا آئینہ دار تھا جو ان کے تحت الشعور میں خوابیدہ تھی ... ہندوستان کی مشکلات چند در چند ہیں لیکن ان کا حل اسی کے اختیار میں ہے۔ ہم اس کے ممد و معاون ہیں

اور حل کی تمام تر ذمہ داری اسی کی ہے"، چنانچہ ایک طرف اقلیتوں کو تھپکی کہ برطانیہ تمہارے مفادات و حقوق سے بخوبی آگاہ ہے اور وہ ایسی فضا کا متمنی ہے جس میں تم خوف سے آزاد جی سکو۔ لیکن! اس لیکن کے ایک ایک نقطہ میں وہ قباحتیں پنہاں تھیں جو تقسیم ہند کی ایک بڑی گردش میں برپا ہو گئیں۔ لیکن اقلیتوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اکثریت کی ترقی میں رکاوٹ ڈال سکیں۔ اقلیت کو بے خوفی کا یقین دلا کر 'چوپا' گیا لیکن اکثریت کی راہ سے ہٹ جانے کی تنبیہ کر کے دولتی بھی رسید کر دی گئی۔ اقلیتوں کے اس نامعقول ذکر نے مسلمانوں کو برہم کر دیا۔ انھوں نے اس لیکن کے پسِ پردہ ہندو انگریزی ناپاک سازش کے عفریت ناچتے دیکھے اور ہندو اکثریت نے اس عفریتی رقص کو آزادی کی نیلم پری کی چھاگل کی جھنکار سمجھا۔ آزاد، صدر کانگرس نے اس کا خیر مقدم کیا۔ گاندھی، مہاتمائے کانگرس نے اسے سراہا اور سیتا رامیہ، نقیب کانگرس نے اس پر خوشی کے شادیانے بجائے۔ قائداعظم نے مخصوص انداز میں مکھی اور مکڑی کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ مکڑی مکھی کو دعوت دیتی ہے کہ جالے کے اندر آؤ۔ اگر مکھی آنے سے انکار کر دے تو مکھی پر رکاوٹ پیدا کرنے کا اعتراض وارد ہو گا اور اس کی روش کو غیر مصالحانہ قرار دیا جائے گا۔ انھوں نے برطانیہ کو انتباہ کیا کہ وہ جھوٹے پروپیگنڈے کے زیر اثر اقلیتوں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص کہ ہندی سیاست کے ضمن میں اقلیت سے مسلمان ہی مراد لئے جا رہے تھے، بدنام کر رہے ہیں۔ قائداعظم کے الفاظ میں وزیر اعظم ہجوم سامعین میں کئی آوازوں سے بول رہے تھے ـــــ درآنحالیکہ مسلمان یک آواز تھے ـــ تقسیم ہند اور قیام پاکستان!

انتخاباتِ عمومی کے نتائج کے باوجود برطانیہ اقلیت و اکثریت کی دلدل سے نہیں نکل سکا تھا۔ وہ دقیانوسی عینک سے تماشا کر رہا تھا۔ گذشتہ ناکامیابی اسی غلط بینی کی رہینِ منت تھی اور وہ بدستور اسی کا مریض تھا۔

ان حالات میں برطانوی وزارت کا وفد ہندوستان پہنچا۔ اب کے ان کے پاس ان کے قول کے مطابق کوئی معین نسخہ نہیں تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مقامی طور پر جملہ قائدین سے مل کر ایسی فضا پیدا کریں کہ وہ از خود کسی فیصلہ تک پہنچ سکیں۔ انھوں نے عہد کر لیا کہ وہ عاملہ نبٹا کر ہی وطن لوٹیں گے وہ سر اس جماعت یا فرد سے ملے جس کی سیاست میں کچھ حیثیت تھی اور جس کے متعلق خیال ہو سکتا تھا کہ وہ

اس ضمن میں کوئی رائے دینے کی اہلیت رکھتا ہے۔

مشن کی آمد کے سلسلہ میں کانگرس اور مسلم لیگ نے اپنے اپنے سیاسی مقاصد کی وضاحت کی۔ کانگرس اسی فرعونیت کی مظہر تھی جس کے افسوسناک مظاہرے کچھ عرصے سے نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ وہ سیاسی آمریت کے خواب ہی نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ اسے متشکل ہوتا سمجھ رہی تھی۔ مشن کو اس نے اپنے فسطائیانہ عزائم کا آلۂ کار تصور کیا۔ پٹیل نے کہا:۔

> کانگرس دو قومی نظریہ کو ہرگز تسلیم نہیں کرے گی اور نہ وہ مذہب پر مبنی قومیت کا تصور قبول کریگی . . . کانگرس صوبجات کی ازسرِ نو تحدید کر کے ان علاقوں کو مکمل خود مختاری دینے کے لئے تیار ہے جہاں کی اکثریت مسلمان ہے لیکن یہ اس شرط سے مشروط ہوگا کہ ایک مضبوط مرکز موجود ہوگا مضبوط مرکز دفاعِ ہند کے لئے ضروری ہے۔

پنڈت نہرو کا مطالبہ یہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی کو پوری طرح تسلیم کیا جائے اور ہندوستانیوں کو اپنے اختلافات رفع کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے کیونکہ

> تیسری قوت کی موجودگی میں ان اختلافات کا حل مشکل ہے۔ . . . جب یہ طے ہو جائے گا کہ ہندوستان آزاد ہوگا تو اس کے مختلف فرقے اور گروہ یا تو مصالحت کر لیں گے یا آپس میں لڑیں گے تا آنکہ مصالحت ممکن ہو جائے۔

الغرض خدایانِ کانگرس مسلمانوں سے سجدوں کا تقاضا کر رہے تھے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ جملہ اقلیتوں کو نظر انداز کر کے مرکزی حکومت کانگرس کے سپرد کر دی جائے۔ اسے وہ آزادی سے موسوم کرتے تھے یہ مسلط شدہ مرکزی حکومت ایک مجلسِ دستور ساز کی تشکیل کا حکم صادر کرے گی جس کا فریضہ تدوینِ آئین ہو گا

وزارتی مشن کے پیشِ نظر مسئلہ ہند کا مستقل حل تھا اس لئے مسلم لیگ نے اپنا قطعی مطالبہ پیش کیا۔ مسلمان نام نہاد قومیت متحدہ ہندیہ کا جزیا ایک فرقہ نہیں۔ وہ جداگانہ ملت ہیں۔ لہذا برصغیرِ ہند کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے ایک پاکستان اور دوسرا ہندوستان۔ اس تقسیم کا اعلان کر کے دو مجالس دستور ساز مرتب کی جائیں جو دونوں علاقوں کے لئے جداگانہ آئین مدّن کریں اور آزاد پاکستان اور آزاد ہندوستان

کی تشکیل کریں۔ جہاں تک عارضی مرکزی حکومت کا تعلق ہے اس پر غور کا اس وقت تک سوال پیدا نہیں ہوتا جب تک کہ مطالبۂ پاکستان بطورِ شرط مقدم اول تسلیم نہیں کر لیا جاتا۔

یہ ملی مطالبہ مسلم ارکان مجالس مقننہ کی اس تاریخی کنونشن اپریل ۱۹۴۶ء میں مرتب ہوا جس میں منتخبینِ انتخابات پانچ سو سے زائد تعداد میں جمع ہوئے اور شہادت بپاکستان کا حلف اٹھایا۔ اس کنونشن نے اس دوسری مجلس دستور ساز کا نمونہ پیش کر دیا جس کا مطالبہ اس کی منظور شدہ قرارداد میں ہوا تھا۔

وزارتی مشن پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان کے متصادم مطالبات کے سایہ میں مصروف کار رہا۔ اپریل کا سارا مہینہ مذاکرات میں گذرا۔ متصادم و متخالف نظریات میں کوئی قدر مشترک نہ مل سکی۔ ۵ مئی کو شملہ کی خنک فضا میں وزارتی مشن نے قائدینِ لیگ و کانگریس کی مشترکہ کانفرنس طلب کی جو نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی اشتراکِ باہمی کی نایاب متاع کی بسیار و لے بے سود تلاش کے بعد آخر کار مشن نے بہ شمولیت وائسرائے اپنا بیان دیا اور وہ طریق کار بتایا جس کے مطابق ان کے نقطۂ نگاہ سے متعلقہ فریق اپنے اختلافات کو رفع کر کے تدوینِ آئین سے متعلق کسی ایک فیصلہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس بیان میں مشن نے اعتراف کیا کہ انھوں نے ملاقاتوں سے نتیجہ نکالا ہے کہ مسلم لیگ کے علاوہ ہر گروہ وحدتِ ہند کا خواہشمند ہے۔ شاید اسی 'اتفاق' اور 'یک زبانی' کا نتیجہ تھا کہ مشن پاکستان کی معقولیت کا انکار نہ کر سکنے کے باوجود اس کے حق میں دو ٹوک فیصلہ نہ دے سکا۔ مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا گیا:

> مسلم لیگ کے تصور کا پاکستان پنجاب، سندھ، سرحد، برطانوی بلوچستان، بنگال اور آسام کے صوبجات پر مشتمل ہوگا۔ مسلم لیگ مسئلہ تحدید پر بعد میں غور کرنے کے لئے تیار ہے لیکن وہ اصولِ پاکستان کی فوری منظوری چاہتی ہے۔

ان صوبجات کی ہندو مسلم آبادی کی تعداد تناسب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا گیا:

> آبادی کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ جس قسم کے پاکستان کا مسلم لیگ مطالبہ کر رہی ہے اس کے قیام سے نہ تو فرقہ وارانہ مسئلہ حل ہو جائے گا اور نہ ہم یہ وجہ جواز دیکھتے ہیں کہ پنجاب اور بنگال کے ان اضلاع اور آسام کو جن میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے آزاد پاکستان میں شامل کر دیں۔

ہر وہ دلیل جو پاکستان کے حق میں دی جا سکتی ہے وہ ہمارے خیال میں ان علاقوں کے پاکستان سے نکال دینے کے حق میں بھی اسی طرح استعمال ہو سکتی ہے۔ یہ معاملہ سکھوں پر خصوصیت سے اثر انداز ہوگا۔

چنانچہ ہم نے اس پر غور کیا کہ آیا کچھ چھوٹا آزاد پاکستان جو مسلم اکثریت کے علاقوں پر ہی مشتمل ہو مصالحت کی اساس بن سکتا ہے؟ ایسے پاکستان کو مسلم لیگ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ کیونکہ اس طرح پنجاب میں سے انبالہ اور جالندھر ڈویژن، آسام سے سلہٹ کے علاوہ دیگر سارا علاقہ اور بنگال سے مغربی بنگال کا معتد بہ حصہ بمعہ کلکتہ پاکستان سے نکل جاتے ہیں ہم خود محسوس کرتے ہیں کہ مشترکہ زبان، تاریخ اور روایات کے پیشِ نظر بنگال اور پنجاب کی تقسیم مناسب نہیں۔ مزید برآں پنجاب کی تقسیم سکھوں کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دے گی۔ فلہذا ہمیں اس نتیجہ پر پہنچنا پڑا ہے کہ پاکستان کلاں یا پاکستان خورد کی آزاد ریاست فرقہ وارانہ مسئلہ کا قابلِ قبول حل مہیا کرنے سے قاصر ہے۔

چنانچہ مشن نے انتظامی، اقتصادی، عسکری، مواصلاتی اور جغرافیائی اعتبارات اور ریاستوں کے نقطۂ نگاہ سے اس رائے کا اظہار کیا کہ

اندریں حالات ہم برطانوی حکومت کو یہ مشورہ نہیں دے سکتے کہ وہ سیاسی اختیارات دو علیحدہ حکومتوں کے سپرد کر دے۔ اس رائے کے باوصف ہم مسلمانوں کے ان بالکل حقیقی خدشات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ وحدتِ ہند کی صورت میں ہندوؤں کی کثرتِ تعداد ان کی ثقافتی سیاسی اور معاشرتی زندگی کو کالعدم کر دے گی۔ کانگریس نے اس کا حل یہ سوچا ہے کہ صوبجات کو مکمل خود مختاری حاصل ہو اور مرکز کے اختیارات کم سے کم مرکزی شعبوں سے متعلق ہوں جیسے امورِ خارجہ، دفاع اور مواصلات۔ اس تجویز کے مطابق صوبے رضامندی سے اپنے کچھ اختیارات مرکز کے حوالے بھی کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں کئی آئینی الجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔ یہ الجھن اور مشکل مرکز میں اور نمایاں ہو جائے گی۔ جہاں اختیاری (Optional) اور

جبری (Compulsory.) اختیارات سے متعلق وزیروں کو بولنے کی اجازت دی جائے گی اور بعض کو رد کیا جا سکے گا۔ اس وقت کے علاوہ صوبوں کو اس سے باز نہیں رکھا جا سکے گا کہ وہ جس ضرورت کے تحت بعض اختیارات مرکز کے حوالہ کریں اسی ضرورت کے تحت ایک دوسرے کی اشتراکِ عمل کر کے تحزب (Grouping) کر لیں۔ لیکن یہ روش ان کی صد خود مختاری سے باہر ہوگی۔

ریاستوں کا ذکر کرتے ہوئے مشن نے کہا:

یہ ظاہر ہے کہ برطانوی ہند کے اندرون یا بیرون دولتِ مشترکہ آزادی حاصل کر لینے کے بعد ریاستوں اور تاجِ برطانیہ کے درمیان جو تعلقات اب تک رہے ہیں وہ ممکن نہیں رہیں گے، اقتدارِ اعلیٰ نہ تاجِ برطانیہ کے پاس رہ سکتا ہے نہ حکومتِ ہند کو منتقل کیا جا سکتا ہے۔ ریاستوں نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ وہ پورے تعاون کے لئے تیار ہیں۔ ان کا تعاون کس شکل میں ہو یہ منحصر ہے اس مصالحت پر جو تدوینِ آئین کے دوران میں طے پائے گی۔

اب ہم وہ حل پیش کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک متفرق فریقوں کے ضروری مطالبات کا علاوہ حل ہے۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ آئین کی تدوین اس اساس پر ہو:

i) برطانوی ہند اور ریاستوں کو ملا کر ایک متحدہ یونین بنائی جائے جو امورِ خارجہ، دفاع اور مواصلات کے محکموں کی ذمہ دار ہو۔ جملہ ایسے اختیارات کی مالک ہو کہ ان امور کے لئے مطلوبہ اخراجات مہیا کر سکے۔

ii) یونین کی ایک انتظامیہ (Executive) ہو اور ایک مقننہ (Legislature.) جو برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوں۔ کسی اہم فرقہ وارانہ مسئلہ کے فیصلہ کے لئے مقننہ میں دونوں فرقوں کے حاضر اور ووٹ دینے والے ارکان کی (علیحدہ علیحدہ) اکثریت نیز کل حاضر اور ووٹ دینے والے ارکان کی اکثریت درکار ہوگی۔

iii) یونین کے محکموں کے علاوہ محکمے اور اختیارات مابقی صوبوں کے قبضہ میں ہوں گے۔

(۱۱) ریاستوں کے پاس وہ تمام اختیارات رہیں گے جو انھوں نے مرکز کے سپرد نہیں کر دیئے۔

(۷) صوبوں کو اختیار ہوگا کہ وہ منتظمہ اور مقننہ مجالس سمیت تحزب (Grouping) کر لیں اور ہر حزب (Group) سے طے کر لے کہ کون سے صوبائی اختیارات مشترک کر لئے جائیں۔

(۷۱) یونین اور احزاب (Groups) کے آئین میں یہ شق موجود ہونی چاہئے کہ ہر صوبہ اپنی مجلس مقننہ کی اکثریت رائے سے مطالبہ کر سکتا ہے کہ دس سال کے ابتدائی عرصہ کے بعد اور اس کے بعد ہر دس سال کے خاتمہ پر آئین پر نظر ثانی کی جائے۔

ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ان خطوط پر آئین کی تفصیلات متعین کریں بلکہ ہمارا مقصد ایسا نظام پیدا کرنا ہے جس میں ہندوستانی ہندوستانیوں کے لئے آئین ترتیب دیں۔

یہ سفارشات جو آئینِ مستقبل کی عام اساس ہوں گی ہمیں اس ضرورت کے تحت کرنا پڑی ہیں کہ دورانِ مذاکرات میں ہم نے دیکھا کہ جب تک یہ نہیں ہو جاتا دو اہم فرقوں کو تدوینِ آئین کے کاروبار میں اشتراکِ عمل پر آمادہ کرنے کی کوئی امید نہیں رہے گی۔

اب ہم تدوینِ آئین کے مجوزہ طریق کار کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔

آئین کے متعلق فیصلہ کرنے والی مجلس (Assembly) کے لئے ضروری ہے کہ وہ ممکن طور پر زیادہ سے زیادہ آبادی کی عمومی نمائندہ ہو۔ اس نمائندگی کے لئے رائے دہندگی بالغان لازمی ہے اس طریقِ کار میں جو ناگزیر تاخیر ہے اس سے بچنے کی صورت یہی ہے کہ موجودہ صوبائی مجالسِ مقننہ کو استعمال کیا جائے۔ جن کے انتخابات حال ہی میں ہوئے ہیں۔ لیکن اس میں قباحت یہ ہے کہ مذکورہ مجالس صوبائی آبادیوں کی صحیح آئینہ دار نہیں۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ان بے قاعدگیوں کے دور کرنے کی منصفانہ اور قابلِ عمل صورت یہ ہے کہ

ا) ہر صوبے کے لئے آبادی کے مطابق نشستیں اس طرح مخصوص کر دی جائیں کہ تخمیناً دس لاکھ آبادی کا ایک نمائندہ ہو۔

ب) یہ مخصوص نشستیں صوبوں کی فرقہ وارانہ تناسب آبادی کے مطابق متعلقہ فرقوں میں تقسیم کی جائیں

ج) یہ گنجائش رکھی جائے کہ ہر فرقہ کا صوبائی تعداد ارکان اسی فرقہ کے ارکان مجلس مقننہ منتخب کریں

ہم سمجھتے ہیں کہ ان مقاصد کے لئے یہ کافی ہوگا کہ صرف تین فرقے یعنی 'عام' (General) مسلم اور سکھ تسلیم کئے جائیں۔ 'عام' میں وہ تمام لوگ آجائیں گے جو مسلم یا سکھ نہیں۔

طرزِ انتخاب متناسب نمائندگی پر مبنی ہوگا اور واحد انتقال پذیر ووٹ (Single transferable vote) سے طے پائے گا۔

(صوبائی احزاب کے) فریق (ا) میں مدراس، بمبئی، یوپی، بہار، سی پی اور اڑیسہ کے صوبجات ہوں گے، فریق ب میں پنجاب، سرحد اور سندھ، اور فریق ج میں بنگال اور آسام۔

دہلی اور اجمیر، مارواڑ کے نمائندگان مرکزی اسمبلی نیز کورگ کے ایک منتخب نمائندہ فریق (Section) (ا) میں شامل ہوں گے اور بلوچستان کا ایک نمائندہ فریق ب میں شریک ہوگا۔

یہ تمام نمائندگان نئی دہلی میں تمہیدی اجتماع کے بعد (ا، ب اور ج) فریقوں میں بٹ جائیں گے یہ فریق ان صوبوں کی تدوینِ آئین کریں گے جو ان کے اجزا ہوں گے۔ وہ یہ بھی فیصلہ کریں گے کہ آیا ان صوبوں کے لئے حزبی آئین (Group Constitution) ترتیب دیا جائے یا نہ۔ ایسا آئین ترتیب دیئے جانے کی صورت میں وہ یہ بھی فیصلہ کریں گے کہ متعلقہ حزب کن شعبوں کو قبضہ میں لے۔ صوبوں کو احزاب سے خارج ہونے کا اختیار ہوگا یہ فیصلہ نئے آئین کے مطابق انتخاب ہوچکنے کے بعد متعلقہ صوبائی اسمبلی کرے گی۔

فریقوں کے نمائندے اور ہندی ریاستیں باہم ملیں گے تاکہ یونین کا آئین مرتب کریں۔

یونین کی مجلسِ دستور ساز میں اس (بنیادی تجویز) کی تبدیلی کے لئے نیز اہم فرقہ وارانہ مسائل سے متعلق تجاویز کے لئے دونوں بڑے فرقوں کے حاضر اور ووٹ دینے والے نمائندوں کی اکثریت درکار ہوگی۔

جبکہ تدوینِ آئین کا کام ان خطوط پر ہورہا ہوگا حکومت کے نظم ونسق کو چلانے اور دیگر امور مہم (جن کی طرف اشارات ہیں) سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک نمائندہ حکومت کی ضرورت ہوگی

وائسرائے نے اس ضمن میں ضروری مذاکرات شروع کردیئے ہیں اور ان کی توقع کے مطابق ایک عبوری حکومت عنقریب تشکیل پذیر ہوجائے گی جس میں رکنِ جنگ سمیت سب سررشتے ان ہندوستانی راہنماؤں کے سپرد ہوں گے جنھیں عوام کا اعتماد حاصل ہوگا۔

یہ ہے خاکہ ان سفارشات کا جنھیں برطانوی وزراء نے سیاسی جماعتوں میں عدم مفاہمت کی صورت میں بطورِ اساس کے پیش کیا۔ برطانوی وزراء نے اس تجویز میں نیز اس کے علاوہ بیانات اور ملاقاتوں میں اپنے خلوص اور اعتدال پسندی کا خوب ڈھنڈورہ پیٹا۔ اس وقت اس بحث میں جانے سے کچھ حاصل نہیں کہ آیا ان کی یہ مساعی مخلصانہ تھیں یا منافقانہ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے دل و دماغ میں پہلے سے چند ایسے مسلمات تھے جو ان کی نیک نیتی تسلیم کی جائے تو کہنا پڑے گا کہ وہ غیر شعوری طور پر ان مسلمات کے زیرِ اثر رہے۔ ہند کے برصغیر کی جغرافیائی وحدت کی دلیل غیر معقول ہے۔ اس لئے نہیں کہ یہ خطہ ارض متصل۔ لہٰذا واحد نہیں، بلکہ اس لئے کہ سیاسی وحدت جغرافیائی وحدت کا لازمی نتیجہ نہیں۔ جغرافیہ کے اپنے اصول ہیں اور سیاست کے اپنے۔ ہندوستان کی سرحد ایران سے ملتی تھی، ایران کی اور ممالک سے۔ لیکن یہ جغرافیائی رشتہ انھیں ایک سیاسی نظام میں مربوط و متحد نہیں کرسکا۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ جب تک جغرافیہ کو تاریخ کی حاونت حاصل نہ ہو اس کی کئی حد بندیاں بے معنی ہوجاتی ہیں۔ یورپ ایک بین جغرافیائی وحدت ہے تاہم ان جغرافیائی حدود کے اندر تاریخ و سیاست نے اپنی جداگانہ بیسیوں حدیں قائم کر رکھی ہیں۔ جغرافیائی اصول مسلم، لیکن انسانی قلب و نگاہ سے ابھرنے والی ان "حدوں" کا کیا توڑ، جن سے انسان ناقابلِ شکست قومی وحدتوں میں منقسم ہوگیا ہے۔ برطانیہ نے ہندوستان میں جغرافیہ کے انہی کتابی اصولوں کو اساسِ استدلال بنایا جنھیں انسان نے کرۂ ارض کے بیشتر قطعوں میں صدیوں سے پامال کر رکھا تھا۔

ایک طرف ہندوستان کا برصغیر اس نام نہاد وحدت کا نمونہ پیش کرتا تھا جو محض جغرافیہ کے نزدیک مسلم تھی اور دوسری طرف انگریزی اقتدار نے ڈیڑھ سو برس کی سیاسی "محنت" سے اس وحدت کو تاریخ و سیاست کی مدد سے ملمع کی حد سے کچھ آگے بڑھا دیا تھا۔ یہ وحدت چونکہ انگریز کی اپنی کوششوں بلکہ بالفاظِ صحیح تر مصلحتوں اور ضرورتوں کا نتیجہ تھی اس لئے وہ غیر شعوری طور پر اس تاریخی محنت کا ضیاع برداشت

نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے سامنے ہندی انتخابات میں بیّن نتائج تھے۔ ان سے کہیں کم نتائج نے انگلستان میں قدامت پسندوں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ لیکن وہ اپنے مسلمات کو اس قدر بنیادی طور پر بدلنے کے لئے تیار نہ تھے کہ ہندوستان کو واحد ملک سمجھنا چھوڑ دیں اور مسلمانوں کو ایک موہوم ہندی قومیت کا ایک فرقہ سمجھنے کی بجائے ایک مستقل قوم کہنا شروع کریں۔ چنانچہ ان کی کوششوں کے چشمے اسی سوت سے پھوٹے کہ ہندوستان ایک ہے اور اسے ایک ہی رہنا چاہیے۔ ۱۹۴۰ء میں برطانیہ نے اعلان کیا تھا کہ وہ کوئی ایسا آئین تسلیم نہیں کرے گا جسے ہندوستانی اقلیتیں منظور نہ کریں۔ ۱۹۴۰ء سے لیکر اب تک اس نے تجربہ سے دیکھ لیا تھا کہ وحدتِ ہند کا تصور مسلمان کے نزدیک ناقابلِ برداشت تھا۔ ملتِ اسلامیہ جمہوری قواعد کے مطابق انتخابات میں دشمنانِ پاکستان کو شکستِ فاش دے چکی تھی۔ لیکن جمہوریت کے نقیب انگریز اس خالصتہً جمہوری طرز سے مرتب نتیجہ کا عملاً انکار کر رہے تھے۔

وزارتی مشن نے ہر چند صوبائی تحزب کی شرط لگا کر پاکستانی صوبوں کو محفوظ کر لیا اور ان کی خود مختاری اور مرکز کی کمزوری سے مسلمانوں کی تالیفِ قلوب کی کوشش ضرور کی وہ اس حد تک مستحسن بھی سمجھی گئی لیکن اس نے اعلانیہ پاکستان کی مخالفت کی اور بزعم خود اسے مسترد کر دیا۔ یہ لفظی استرداد اپنا اثر کئے بغیر نہ رہ سکا۔ مسلمان بہت بد دل ضرور ہوا مگر اس نے من حیث القوم رائے زنی سے اس وقت تک اجتناب کیا جب تک کہ سفارشات زیرِ نظر کے مالہٗ وما علیہ پر کما حقہٗ غور نہیں کر لیا۔ اس کے برعکس ہندوؤں کے ہاں گھی کے چراغ جلے اور انھوں نے ——— غالباً ——— بلا سوچے سمجھے یہ سن کر اور پڑھ کر برطانوی مشن نے پاکستان ——— خورد و کلاں ——— کو مسترد کر دیا ہے خوشی کے شادیانے بجائے۔ مسٹر گاندھی نے اس تجویز میں وہ جراثیم دیکھے جو اس بد قسمت ملک کو خوش قسمت بنا دینے کے ذمہ دار ہو سکتے تھے۔ ہندو کے زبان و قلم اس خوش آئند تجویز کے حق میں رطب اللسان تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر مسلمانوں کی قیادت ان سے مرکب ہوتی جو جذباتی ہوتے اور معاملہ پر سطحیت سے نگاہ ڈالتے تو مشن کے یہ غیر معتدل الفاظ یقیناً اس تجویز کے استرداد میں منتج ہوتے۔

اس لفظی بحث اور مشن کے اپنے بیانات کو چھوڑتے ہوئے بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مشن نے کانگرس اور مسلم لیگ کے متضاد مطالبات میں وجہ اشتراک پیدا کرنے کی دلیرانہ اور قابلِ تعریف کوشش کی۔ کانگرس وحدتِ ہند کی متقاضی تھی مگر مسلم لیگ کی مخالفت سے مجبور ہو کر اس نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ کسی علاقے کو اس کی منشاء کے خلاف مرکز کے ماتحت نہیں رکھ سکتی۔ مسلم لیگ چھ صوبوں کا مرکز سے مکمل انقطاع چاہتی تھی۔ مشن نے کانگرس کی خوشنودی کے لئے مرکز ضرور قائم رکھا لیکن مسلم لیگ کی خاطر اس کا دائرۂ عمل یہاں تک محدود کر دیا کہ صرف تین شعبے اس میں رہ گئے۔ اس کے ساتھ ان کی یہ شرط کہ مرکز کو مطلوبہ اخراجات مہیا کرنے کے اختیارات حاصل ہونے چاہئیں مسلم لیگ اور کانگرس میں وجہ نزاع بن گئی۔

کانگرس مرکز کو مضبوط بنانے کے خیال سے اس کا مفہوم یہ لے رہی تھی کہ مرکز اس مطلب کے لئے ٹیکس عائد کرے گا مگر مسلم لیگ مرکز کو یہ مزید اختیار دینے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ صوبے مرکز کو ضروری اخراجات دے دیا کریں لیکن ٹیکس عائد کرنے اور وصول کرنے کے ذمہ دار وہ خود ہوں نہ کہ مرکز۔ یہ امور باہمی گفتگو سے طے ہو سکتے تھے مگر کانگرس کی خودسری اور ضد نے یہ نوبت نہ آنے دی اور آخر دم تک کوئی مفاہمت نہ ہو سکی۔

کانگرس کے مرکز قائم رکھنے کا مطالبہ تو تسلیم کر لیا گیا لیکن مرکز کو کمزور بنا دیا گیا تھا۔ ان کے مطالبہ میں یہ تخفیف روا رکھی گئی تو اس کی تلافی یوں کر دی گئی کہ مسلمان اکثریت والے صوبوں کو مرکز سے علیحدہ نہیں ہونے دیا بلکہ ان کے زیر اطاعت رکھا۔ اس طرح مسلم لیگ کی مخالفت کے علی الرغم کمزور مرکز تو مسلط کر دیا گیا مگر ان کی تسلی کے لئے چھ صوبوں یعنی آسام اور بنگال کو فریق ج میں اور پنجاب، سرحد سندھ اور بلوچستان کو فریق ب میں داخل کر کے ان کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دیدی اور اس طرح اکھنڈ ہندوستان اور پاکستان میں مطابقت پیدا کر دی۔ صوبائی تحزب میں پھر اکھنڈ ہندوستان کے لئے یہ رعایت رکھی گئی کہ نئے آئین کے بعد منتخب اسمبلیاں یہ فیصلہ کرنے کی مجاز ہوں گی کہ کوئی صوبہ متعلقہ صوبائی حزب میں نہ رہے لیکن پاکستان کی رعایت کے لئے اس صوبائی تحزب کو ابتداءً جبر

قرار دیا۔ یعنی کسی صوبے کو یہ اختیار نہیں کہ وہ متعلقہ فریق میں شامل نہ ہو۔ محض یہی نہیں بلکہ شمولیت کے بعد صوبوں پر اور پابندی بھی تھی۔ تحزب کی صورت میں جو مشترکہ شعبے احزابی مرکز میں رکھے جانے تھے ان کا فیصلہ متعلقہ حزب کرے گا نہ کہ صوبہ خود۔ مثلاً فریق ب میں صوبہ سرحد جو اس وقت کانگرس وزارت کے زیرِ اقتدار تھا اور جس کی آزادی کا کانگرس کی طرف سے خصوصیت سے ڈھنڈورہ پیٹا جاتا تھا مجبور تھا کہ فریق ب میں شامل ہو۔ اس شمولیت سے سرتابی خارج از بحث تھی۔ مزید برآں تدوینِ آئین کے وقت فریق ب کے چاروں صوبے مل کر یہ فیصلہ کرتے کہ صوبے (بشمول سرحد) کون کون سے اختیارات اس احزابی مرکز (جس کی حیثیت آل انڈیا مرکز کے ماتحت مرکز کی ہوتی) کو دیتے۔ گویا اس حد تک تو اس مصنوعی کانگرسی صوبے "پاکستان" کا پابند بنا دیا گیا تھا لیکن اس صوبائی حزب کی نگرانی میں تیار کئے ہوئے آئین کے مطابق منتخب اسمبلی کو یہ اختیار دیا گیا کہ اگر وہ کثرتِ رائے سے یہ فیصلہ کرلے کہ صوبہ سرحد کو اس حزب میں نہیں رہنا چاہئے تو یہ صوبہ مذکورہ حزب سے نکل سکتا ہے۔

مسلم لیگ کے لئے یہ اہم رعایت تھی۔ وہ چھ صوبے جن کو پاکستان میں شامل کرنے کا وہ مطالبہ کر رہی تھی اسے بجنسہٖ مل رہے تھے کانگرس از خود اس کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس کا اعتراض خصوصیت سے دو صوبوں پر تھا۔ ایک طرف آسام تھا اور دوسری طرف سرحد۔ آسام جس کی آبادی کا ایک تہائی حصہ ہندو تھا اور باقی غیر ہندو۔ کانگرسی پروپیگنڈے اور برطانوی نوازشات کے بدلے میں ہندو صوبہ سمجھا جا رہا تھا۔ کیونکہ آئینی طور پر آبادی یا مسلم تھی یا 'عام' (General) اس 'عام' کے تحت تمام غیر مسلم آجاتے تھے اور انھیں عموماً ہندو سمجھا جاتا تھا۔

ضمناً یہاں یہ کہنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ خود وزارتی مشن کی سفارشات میں بھی یہی 'رعایت' موجود تھی۔ ہر شخص جو غیر مسلم اور غیر سکھ تھا وہ عام ـــــ ہندو ـــــ تھا۔ آسام کی آبادی میں بحیثیتِ واحد جماعت مسلمان اکثریت میں تھے۔ نیز اس کی آبادی کے دیگر غیر مسلم عناصر بلکہ مقامی ہندو عنصر کا معتدبہ حصہ وحدتِ ہند کے حق میں نہ تھا۔ وہ اپنے جداگانہ حقوق طلب کر رہے تھے لیکن بدقسمتی سے آسام کی وہ آبادی جو قبائلیوں اور بسماندہ اقوام پر مشتمل ہے اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی کہ وہ اپنے سیاسی حقوق کا

صحیح شعور رکھتی ہو اور اس کے لئے وقت پر مناسب جدوجہد کر سکے۔ ان کی بیچارگی کا آئین نے کانگرس کو فائدہ پہنچایا۔ ان سب کو 'عام' یعنی ہندو قرار دیتے ہوئے کانگرس کا مطالبہ یہ تھا کہ آسام براہ راست مرکز ہند سے وابستہ رہے اور فریق ج میں شامل نہ ہو۔

دوسرا صوبہ سرحد تھا جس کی پچانوے فی صدی آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ اس صوبے کی وزارت پر کانگرس متمکن تھی۔ ہر چند یہاں کی آبادی مسلمانوں کی تھی اور وہ مجموعی طور پر ــــ باستثنائے معدودے چند ــــ پاکستان کے حق میں تھے مگر کانگرس اس صوبے کو اس لئے مرکز سے مربوط کرنا اور فریق ب سے باہر رکھنا چاہتی تھی کہ وہ "کانگرسی" صوبہ تھا۔ مسلم لیگ نے بارہا اس امر پر زور دیا کہ مسلم لیگ اسمبلی میں اقلیت میں ہونے کے باوجود سرحدی عوام میں مقبول و ہر دلعزیز ہے اور وہ سرحد میں پاکستان کے مسئلہ پر انتخاب و استصواب کے لئے تیار ہے لیکن کانگرس نے اپنی کمزوری کا احساس رکھتے ہوئے اس دعوتِ مقابلہ کو قبول نہ کیا۔ کانگرس کی پوزیشن آسام کے مقابلہ میں سرحد میں بہت کمزور تھی۔ آسام میں ہر چند اس کی قیادت مسلم نہیں تھی مگر اسے ایک تو یہ فائدہ حاصل تھا کہ مسلمانوں کے علاوہ دیگر عناصر سیاسی حقوق کا نہ تو صحیح شعور رکھتے تھے اور نہ حقوق طلبی کی اہلیت۔ دوسرے وہ غیر ہندو ہونے کے علاوہ غیر مسلم بھی تھے۔ ان کا ہندو کانگرس کے ساتھ نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ وہاں کانگرس ان عناصر کو دھوکہ دے کر اپنے آپ سے وابستہ رکھ سکتی تھی۔ لیکن سرحد میں صورت بالکل مختلف تھی۔ وہاں کے مسلم عوام بیدار تھے اور اپنے حقوق پہچانتے ہی نہیں تھے بلکہ ان کے حصول کی خاطر آئینی ــــ اور غیر آئینی ــــ جنگ بھی کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود کانگرس نے دونوں صوبوں کو مسلمانوں سے چھیننے کی پوری کوشش کی۔ یہ کوشش از قبیل "بغضِ معاویہ" تھی۔ کانگرس ہر اس اقدام کی مخالف تھی جس سے مسلمانوں کو کچھ فائدہ پہنچ سکتا تھا۔

مشن کی سفارشات نے یہ صوبے مناسب شرائط کے ساتھ مسلم لیگ کو دلوا دیئے۔ کانگرس نے اس ضمن میں حجت بازی، حیلہ سازی اور موشگافی سے کام لیا۔ سب سے پہلے مسٹر گاندھی نے اس خیال کا اظہار کیا کہ تحریب جبری نہیں۔ کانگرس نے اس توجیہ کو اپنایا۔ کانگرس اس سے قبل صوبائی خود مختاری کو

زیادہ وسیع کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن اب اس نے صوبائی خود مختاری کے نام پر یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ صوبے تحریب میں مجبور و پابند ہیں۔ مشن کو بارہا اپنے بیانات میں اس شق کی وضاحت میں کہنا پڑا کہ صوبوں کا تحریب جبری ہے البتہ نئے آئین کے بعد نئی اسمبلی کی کثرت رائے سے وہ حزب متعلقہ سے نکل سکتے ہیں لیکن مصنف کے اس "بیان" کے باوجود کانگرس اسی ضد پر قائم رہی کہ ان کی توجیہ صحیح اور مسلم لیگ بلکہ خود مشن کی توجیہ غلط۔ صوبائی تحریب سے متعلق شق نے خوب گل کھلائے اور آخر الامر اس اقدام کے لئے راستہ صاف کر دیا جس سے بچنے کے لئے کانگرس یہ مجنونانہ تگ و تاز کر رہی تھی۔

فریق ب اور ج میں مسلمان نشستوں کا تناسب پچاس فیصدی سے زیادہ تھا۔ فریق ج کی مجموعی ستر نشستوں میں سے چھتیس مسلمانوں کی تھیں۔ گذشتہ انتخابات کے باعث یہ نشستیں تمام کی تمام مسلم لیگ کے قبضہ میں تھیں۔ اس کے برعکس 'عام' چونتیس نشستوں میں بعض یورپینوں کو بھی مل سکتی تھیں، کیونکہ بنگال اور آسام کی اسمبلیوں میں ان کی کافی نمائندگی تھی۔ ان کے آنے سے کانگرس کی تعداد ارکان چونتیس سے بھی کم رہ جاتی۔ چنانچہ کانگرس نے یہ شوشہ چھوڑا کہ یورپینوں کو حق نیابت نہیں دینا چاہئے، مہربان اور سخی وزارتی مشن نے فوراً یہ مطالبہ بھی منظور کر لیا اور کانگرس کا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا کہ گو مسلمانوں کے ارکان کم نہیں ہوئے اُن کے توڑ بڑھ گئے۔

مشن کی تجویز کے مطابق صوبائی احزاب تین مرکزی شعبوں کے علاوہ آئین سازی میں خود مختار تھے مسلم لیگ کا مطالبہ مکمل انقطاع اور قیام پاکستان کا تھا جسے مشن نے لفظی طور پر مسترد کر دیا تھا۔ مگر آئین میں یہ گنجائش رکھ دی گئی کہ کوئی صوبہ اسمبلی کی کثرت رائے سے دس سال کے بعد آئین پر نظر ثانی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ یہ شق اس لحاظ سے مفید تھی کہ پیش نظر تجویز کے مطابق ایک آئین مرتب کر لیا جائے اور اسے دس سال تک چلایا جائے، پھر تجربہ کی روشنی میں اس پر اگر ضرورت ہو تو۔ نظر ثانی کر لی جائے۔ انسان کا بنایا ہوا کوئی آئین مکمل اور قطعی نہیں ہو سکتا۔ اس میں وقتاً فوقتاً مقتضیات کے مطابق اصلاح و ترمیم ناگزیر ہو جاتی ہے لیکن اس پر اعتراض وارد ہوتا تھا کہ جو زیادتی یا کمی آئین میں ایک مرتبہ پیدا ہو گئی اس سے دس سال تک پیچھا نہیں چھڑایا جا سکیگا۔ قوموں کی زندگی میں دس سال کا عرصہ چنداں طویل نہیں ہوتا اور اس تجربہ کے لئے بظاہر

یہ موزوں عرصہ تھا مگر ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی بداعتمادی نے اس خدشہ کو موہوم نہیں رہنے دیا تھا۔ کانگرس نے اس قسم کی توجیہیں شروع کر دی تھیں کہ مسلمانوں کے لئے ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ اس سے حسنِ ظن رکھیں یا یہ توقع ہی رکھیں کہ آئین سازی میں وہ برابر کے شریک کا ثبوت دیگی۔ کانگرسی حلقوں سے یہ شور اٹھا کہ مجلس دستور ساز آزاد مجلس ہے۔ یہ مجلس اس حد تک تو آزاد تھی کہ اس کے فیصلوں میں کوئی بیرونی قوت مداخلت نہ کرتی یا اثر انداز نہ ہوتی لیکن ہندو اسے آزاد کہہ کر کچھ اور مفہوم لے رہے تھے وہ اسے آزاد قرار دیکر ان قیود و شرائط سے بھی آزاد کر رہے تھے جو برطانوی سفارشات میں موجود تھیں اور جن کے سبب سے اس کی تشکیل ہونی تھی۔

۲۵ مئی کو صدر کانگرس نے وائسرائے کو خط لکھا جس میں کانگرس مجلس عاملہ کی طرف سے کہا گیا تھا کہ مجلس دستور ساز ایسی آزاد جماعت ہے جس کا مرتب کیا ہوا آئین قطعی ہوگا۔ وہی مجلسِ آئین مرتب کریگی اور وہی اسے نافذ کرے گی۔

مسلم لیگ نے اس توجیہ کو قبول نہ کیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ مجلس مذکورہ کو 'آزاد' نہیں دیکھنا چاہتی تھی بلکہ اس لئے کہ وہ اس بے آئینی کے خلاف تھی۔ سفارشات قبول کرنا اور اس کے ماتحت اس میں عائد کردہ شرائط کے ساتھ مرتب ہونے والی مجلس دستور ساز کو آزاد سمجھنا متضاد باتیں تھیں۔ اس نے مسلمانوں کے شکوک کو اور مستحکم کر دیا۔

مسلمانوں کے شکوک کے ازالہ کی ایک صورت یہ تھی کہ مجلس دستور ساز کے جو فیصلے اہم فرقہ وارانہ مسائل سے متعلق ہوں گے ان کے لئے دونوں فرقوں کے حاضر اور ووٹ دینے والے ارکان کی علیحدہ علیحدہ اکثریت درکار ہوگی۔ یہ تسلی بخش شرط ہوتی مگر کانگرس نے ازرہ غایت بے خودی اپنے عزائم کو کچھ اس انداز سے آشکار کیا کہ یہ خدشہ قوی ہو گیا کہ کانگرس اپنی اکثریت کا ناجائز استعمال کریگی۔ مزید برآں 'فرقہ وارانہ' ایک مبہم لفظ تھا اس کا مفہوم، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ہندوؤں کے نزدیک کچھ تھا اور مسلمانوں کے نزدیک کچھ اور۔ مثلاً بعض تجارتی کاروبار خالصۃً مسلمان کے ہاتھ میں تھے۔ تو اگر اس مخصوص تجارت پر کوئی پابندی عائد کی جاتی تو بظاہر وہ ایک اقتصادی مسئلہ ہوتا مگر درحقیقت وہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہوتا۔ ایسے میں مسلمان

بضد ہونے کہ مسئلہ فرقہ دارانہ ہے اور ہندو اس سے انکار کرتے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون یہ فیصلہ کر سکتا تھا کہ کون مسئلہ فرقہ دارانہ ہے یا نہیں۔ اس فیصلے کا اختیار مرکزی مجلس دستور ساز کے صدر کو حاصل تھا۔ گویا صدر جس مسئلہ کو غیر فرقہ دارانہ قرار دیتا اس کی نوعیت کچھ بھی ہوتی اسے فرقہ دارانہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ اختیار صدر کو دے کر وزارتی مشن نے مسلمانوں کی پوزیشن کمزور کر دی تھی۔ کیونکہ صدر مجلس لامحالہ ہندو ہوتا اور کوئی ہندو سوائے عبادت یا دیگر رسوم و علامات ظاہری سے متعلق امور کو فرقہ دارانہ متصور نہ کرتا۔ صدر کے اس قسم کے فیصلوں کے خلاف صرف اتنا کیا جا سکتا تھا کہ کوئی فرقہ یہ درخواست کر سکتا تھا کہ اس معاملہ میں فیڈرل کورٹ سے بھی مشورہ کر لیا جائے۔ اس طریقہ میں پھر یہ مشکل تھی کہ صدر پر پابندی صرف اس قدر تھی کہ وہ فیڈرل کورٹ سے مشورہ کرے لیکن اسے کورٹ کا فیصلہ بہرحال منظور کرنے پر پابند نہیں کیا گیا۔ وہ کیسے مشورہ کرتا؟ یہ بھی غیر واضح تھا۔ گویا اس ضمن میں قطعی رائے صدر کی تھی اور یہ مسلمانوں کے لئے ازحد غیر تسلی بخش تھا۔

ریاستوں کی پوزیشن یہ تھی کہ ان کے نمائندے احزابی آئین کی تدوین کے بعد مرکزی اسمبلی میں احزابی نمائندوں کے ساتھ شریک ہوں گے اور سب مل کر یونین کے تین شعبوں پر مشتمل دستور نامے تیار کریں گے۔ برطانوی اقتدارِ اعلیٰ کے خاتمہ پر ریاستوں کو ہر نوع نئے آئین میں اپنی جگہ متعین کرنا تھی۔ پہلے تو والیانِ ریاست انگریزی سایہ سے محرومی اور شخصی حکومت کے خاتمہ کے تصور سے سیخ پا ہوئے لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے محسوس کیا کہ ان کی قسمت نئے بندوبست کانگرس سے وابستہ ہے کیونکہ وہی ایک ایسی سیاسی جماعت تھی جو بظاہر انگریز کی جانشین بنتی نظر آتی تھی۔ کانگرس کی پروپیگنڈہ مشینری نے اس خیال کو خوب تقویت دی۔ یوں بھی والیانِ ریاست بیشتر ہندو تھے۔ انھوں نے اپنی عافیت کانگرس سے تعاون میں ہی دیکھی۔ اس تعاون کے جو نتائج نکلے اس کے تصور سے انسانیت کانپتی ہے۔ وحشت و بربریت کی یہ ہولناک داستان ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

ہر چند ریاستوں کی شرکت کا سوال احزابی آئین کی تدوین کے بعد پیدا ہوتا تھا لیکن اکا دکا ریاستوں نے مجلس دستور ساز میں شریک ہونے کا اعلان شروع کر دیا۔ یہ حرکت غیر آئینی تھی مگر کانگرس اپنی پوزیشن کے

استحکام میں دیوانہ وار مصروف تھی۔ اس نے آئین و شرائط آئین کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ ریاستوں کے اس رویہ نے مسلمانوں کے شبہات کو یقین میں تبدیل کر دیا کہ کانگرس سفارشات کی آڑ لے کر من مانی کارروائیاں کریگی اور اپنی کثرت کے بل بوتے پر مسلمانوں کو آئندہ آئین میں کوئی جگہ نہیں دیگی۔

برطانوی سفارشات کا دوسرا حصہ عبوری دور میں عارضی مرکزی حکومت کی تشکیل سے متعلق تھا۔ اس پر ہم ذرا آگے چل کر تبصرہ کریں گے۔

۱۶ مئی کو سفارشات شائع ہوئیں اور کانگرس اور مسلم لیگ میں اعصابی جنگ شروع ہو گئی۔ کرپس تجاویز کے استرداد کے وقت سے کانگرس نے عام طور پر یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ لیگ نے تجاویز کو اس لئے مسترد کیا ہے کہ اس سے پہلے کانگرس نے انھیں مسترد کر دیا تھا۔ نیز مسلم لیگ نے استرداد میں محض کانگرس کی تقلید کی ہے اور بس۔ وہ از خود اجتہادی فیصلے نہیں کر سکتی۔ کانگرس نے اس موقع پر یہ چال چلی کہ وہ اپنے فیصلے کو اس وقت تک ٹالتی رہے جب تک کہ مسلم لیگ فیصلہ نہ کر لے۔ چنانچہ کانگرس نے مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا اور ۲۴ مئی کو اس مقصد کی قرارداد پاس کر کے ملتوی کر دیا کہ ہنوز تصویر مکمل نہیں لہٰذا عاملہ قطعی رائے نہیں دے سکتی

۲۲ مئی کو قائداعظم نے شملہ سے ایک بیان شائع کیا جس میں برطانوی سفارشات پر تبصرہ کیا گیا تھا۔ اس بیان کا انداز کانگرس کے لئے گمراہ کن ثابت ہوا۔ کیونکہ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسلم لیگ سفارشات کو نامنظور کر دیگی۔ اس غلط فہمی نے کانگرس کو مجبور کیا کہ وہ اپنا فیصلہ اس وقت کرے جب مسلم لیگ فیصلہ دے کر سفارشات کو مسترد کر دے۔ وہ اس طرح مسلم لیگ کو ایک طرف کر کے سفارشات منظور کر کے ساری حکومت تنہا سنبھال لینے کے منصوبے سوچ رہی تھی۔ مسلم لیگ نے بلا غیر ضروری تاخیر عاملہ اور کونسل کا اجلاس طلب کیا اور سفارشات کا پورا جائزہ لے کر انھیں منظور کر لیا۔ لیگ نے یہ حق محفوظ رکھا کہ اگر مذاکرات کے دوران میں کسی وقت ایسی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ اس قرارداد کے فیصلہ کی پابند نہیں رہے گی بلکہ تقاضائے وقت کے مطابق اسے بدل دیگی۔ نیز اس کی روش دستور تو پر بھی منحصر ہے۔

مسلم لیگ نے قرارداد منظوری ۶ جون کو منظور کی۔ اس سے پیشتر قائداعظم نے وائسرائے سے دریافت کیا کہ اگر دو پارٹیوں میں سے صرف ایک پارٹی سفارشات قبول کرے تو کیا ہوگا۔ وائسرائے نے ۱۰ جون کے

مراسلہ میں وزارتی وفد کی طرف سے یہ یقین دلایا کہ دو پارٹیوں میں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی اور جو پارٹی بھی سفارشات کو منظور کر لے گی اس کے ساتھ مل کر حالات کے مطابق آگے بڑھا جائیگا۔ یہ اہم ضمانت تھی جو وائسرائے نے برطانوی وزارتی وفد کی طرف سے مسلم لیگ کو دی۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر کانگرس مجوزہ سکیم کو مسترد کر دے تو برطانیہ مسلم لیگ کی مدد سے کاروبارِ حکومت چلائے گا تا آنکہ کانگرس آمادہ بہ تعاون ہو جائے۔ یہ ضمانت نہایت اہم ہے اور اسے خصوصیت سے پیشِ نظر رکھنا چاہئے کیونکہ آئندہ چل کر یہ ایک نازک نزاع کی صورت اختیار کر گئی۔

(گنجائش کم ہونے کے باعث اس مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اشاعت آئندہ میں برطانوی وفد کی عبوری دور سے متعلق تجاویز اور بعد کے آئینی مذاکرات کا ۳ رجون ۱۹۴۷ء کے اعلانِ پاکستان تک کا جائزہ لیا جائے گا۔ انشاء اللہ)

محاسبۂ نفس

کارگہِ حیات کا تمام نظم و نسق سعی و عمل پر چل رہا ہے۔ اور یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ مساعی و اعمال، صحیح نتائج بھی مرتب کر رہے ہیں یا نہیں، ان کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اس کا نام محاسبۂ نفس ہے جو راہ رو یہ نہیں دیکھتا کہ اس نے کس قدر مسافت طے کر لی ہے اور باقی راستہ کتنا رہ گیا ہے اسے منزل تک پہنچنے کی حتمی امید نہیں رکھنی چاہئے، اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ کسی دوراہے پر وہ غلط موڑ مڑ گیا ہو اور اس کے بعد وہ ہر چند چلا جا رہا ہو لیکن اسے اس کا احساس تک بھی نہ ہو کہ اس کا ہر قدم اُسے منزل سے دور سے دور تر کرتا چلا جا رہا ہے۔ جو مریض، مقیاس الحرارت کی جدول مرتب نہیں کرتا وہ کبھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کا علاج صحیح ہو رہا ہے یا نہیں۔ جو دکاندار کبھی اپنا ہی کھاتہ نہیں ملاتا اور وقتاً فوقتاً اپنا (Stock taking) نہیں کرتا وہ کبھی نہیں محسوس کر سکتا کہ اس کی تجارت نفع مند ہے یا اُسے خسارہ کی طرف لئے جا رہی ہے۔ پھر جب انفرادی زندگی میں محاسبۂ نفس یا جائزۂ اعمال کی اس قدر ضرورت ہے تو ظاہر ہے کہ اجتماعی زندگی میں یہ ضرورت اور بھی اہم و اشد ہو جاتی ہے۔ جو قوم یہ نہیں دیکھتی کہ بساطِ سیاست پر اس سے کون سی چال غلط چلی گئی اُسے بازی جیتنے کی بہت کم توقع رکھنی چاہئے۔ جو اس کا اندازہ نہیں کرتی کہ فلاں دوراہے پر اس کا قدم کس طرف اٹھ گیا وہ جہانِ مسابقت و دنیائے منافست میں امامت و قیادت کی امیدوار نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ جائزہ و موازنہ اور محاسبہ و مقابلہ ہے جسے بالفاظِ دیگر تنقید کہتے ہیں۔ متاعِ زندگی کی صحیح پرکھ محکِ نقد و نظر پر ہی ہو سکتی ہے جو اپنی تنقید آپ کر لیتا ہے اُسے پھر کسی دوسرے کی تنقید سے ڈرنے اور جھجکنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ اپنے مال کی قیمت کو خوب جانتا ہے۔ اس لئے وہ اسے دنیائے بیع و شری کی ہر منڈی میں بلا تردد و تامل پیش

کر دیتا ہے۔ لیکن جو قوم تنقیدِ اعمال کو برداشت نہیں کرتی وہ ہمیشہ دوسروں کے مقابلہ میں آنے سے گھبراتی اور خوف کھاتی ہے۔ اس لئے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کرتی۔

اس میں شبہ نہیں کہ ایک تنقید غیروں کی ہوتی ہے جس کا مقصد تخریب کے سوا کچھ نہیں ہوتا لیکن ایک تنقید خود اپنوں کی ہوتی ہے جو صحیح تعمیر کی بنیاد بنتی ہے۔ ایک تنقید گلچیں کی ہے جس کا ماحصل غارتگریٔ متاعِ ہوتا ہے۔ لیکن ایک تنقید باغباں کی ہوتی ہے جس کا مآل برومندی و ثمرآوری ہوتا ہے۔ ایک نوکِ شمشیر دشمن کی ہوتی ہے جس سے انسان عمر بھر کے لئے اندھا ہو سکتا ہے اور ایک نوکِ شمشیر مشفق جراح کی ہوتی ہے جو دیدۂ کور میں پھر سے بینائی لے آنے کا موجب بنتی ہے۔ جو قومیں اپنے مزاج و کردار میں پختگی تک پہنچ جاتی ہیں وہ اپنے تو اپنے، غیروں کی تنقید سے بھی نہیں ڈرتیں بلکہ ان سے بھی فائدہ اٹھا لیتی ہیں۔ لیکن جو قوم خود اپنوں کی تنقید (یا محاسبۂ نفس) سے بھی گھبراتی ہے، یقین مانئے کہ اسے اس کارگہِ سعی و عمل میں، کہ جہاں تنازع للبقاء (Struggle for existence.) کا محکم گیر قانون بلا رعایت ہر وقت سرگرمِ عمل ہے۔ زندہ رہنے کا کبھی حق نہیں دیا جا سکتا۔ جو طالب علم امتحان سے گھبراتا ہے وہ دنیائے علم و فضل میں کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جو قوم اپنے اعمال کو میزانِ احتساب میں تولنے سے جھجکتی ہے اس کے حصہ میں قیام نہیں ہے۔ لہٰذا زندہ یا زندگی کی آرزومند قوم کو اپنے محاسبۂ نفس یا تنقیدِ اعمال سے کبھی تسامح نہیں برتنا چاہئے۔ اگر تنقیدِ خالص یا احتسابِ خویش ہمیں بتاتا ہے کہ فلاں مقام پر ہم غلطی کر گئے ہیں تو اس میں سبکی کی کوئی بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے بدبختی سے غلطی کو گناہ سمجھ رکھا ہے اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ جس طرح ہم سے ہر شخص اپنے آپ کو (بطور کسرِ نفسی) گناہگار کہتا ہے لیکن جب اس کے کسی واقعی گناہ کی طرف اشارہ کیجئے تو وہ اس کا کبھی اعتراف نہیں کرتا۔ اسی طرح ہم بطور اصول تو ہر وقت کہتے ہیں کہ غلطی انسان کی فطرت میں ہے (To err is human) لیکن جب کسی غلطی کو اس کے سامنے لائیے تو وہ اس کے اعتراف سے اسی طرح گھبراتا ہے جیسے کوئی ملزم، اقبالِ جرم سے۔ وہ پوری کوشش کرے گا کہ کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کر دے کہ جسے ہم اس کی غلطی کہتے ہیں وہ یا تو غلطی تھی ہی نہیں، عین راہِ صواب تھی، یا اگر غلطی

تھی تو اُس کی نہیں تھی کسی اور کی وجہ سے تھی۔ خواہ ایسا کرنے میں اسے کتنے ہی لچر دلائل اور کیسی ہی پوچ توجیہات سے کام کیوں نہ لینا پڑے۔ حالانکہ غور سے دیکھئے تو غلطی گناہ کی بات نہیں جس سے اس قدر شرمایا جائے۔ غلطی تو انسانی فکر و عمل کی حریت کی دلیل ہے۔ یہ تو اس کے اختیار و ارادہ کی آئینہ دار ہے پتھر کبھی غلطی نہیں کرتا۔ اور اسی طرح فرشتہ سے بھی غلطی کا امکان نہیں اس لئے کہ انھیں اپنے فیصلوں میں کوئی اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا۔ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے جس کے استعمال میں اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ انہی غلطیوں سے سبق حاصل کر کے قومیں آگے بڑھتی ہیں۔ تجربہ، جو نوعِ انسانی کے تمام کسب و ہنر اور متاع و حاصلِ زندگی کی بنیاد ہے، غلطیوں سے حاصل کردہ اسباق کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا غلطی کوئی جرم نہیں۔ گناہ نہیں۔ البتہ غلطی پر اصرار، حماقت ہے اور جرمِ عظیم۔ اور یہ اصرار بسا اوقات (بلکہ بیشتر) اس صورت میں ہوتا ہے کہ قوم اپنے اعمال کا جائزہ نہیں لیتی اور انھیں تنقید کی محک پر نہیں پرکھتی، اس لئے اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کہاں کہاں غلطی کر گئی ہے اور اس طرح نادانستہ غلطیوں پر اصرار کئے جاتی ہے۔ لیکن غلطی پر اصرار یا اس کی تکرار، خواہ دانستہ ہو خواہ نادانستہ، نتائج کے اعتبار سے یکساں ہوتی ہے۔ سنکھیا دانستہ کھائیے یا نادانستہ، اس کی سمیت تو بدستور اپنا کام کر جائیگی۔ لہٰذا وہی شخص قوم کا صحیح مشفق و ہمدرد ہے جو اسے اس کی غلطیوں پر متنبہ کرے اور وہی قوم سلامتی کی راہ پر چل سکتی ہے جو اس تنبیہ و تنذیر پر چیں بجبیں ہونے کی بجائے اسے خندہ پیشانی سے قبول کرے اور ان غلطیوں کی روشنی میں آئندہ صحیح قدم اٹھائے۔

آیئے ہم، متذکرہ صدر مبادیات کی روشنی میں یہ دیکھیں کہ قیامِ پاکستان کے وقت ہم سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں تاکہ ہم انھیں سامنے رکھ کر، ایسا لائحہ عمل مرتب کریں کہ آئندہ ایسی غلطیاں ہم سے سرزد نہ ہوں۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اس تنبیہ کی ضرورت عام حالات میں بھی کم نہیں ہوتی لیکن ایک نوزائیدہ مملکت کے لئے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ اس میں ابھی اتنی قوت نہیں ہوتی کہ اس قسم کی غلطیوں کے نتائج و عواقب کا مدافعہ کر سکے۔ بڑی عمر میں انسان کچا اناج بھی ہضم کر لیتا ہے لیکن بچے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کی ماں ثقیل غذا کھائے تو خود بچے کو سوء ہضمی ہو جاتی ہے اس لئے ہمیں تو

اس باب میں اور بھی حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔ خدا کرے کہ ہمارے اس اقدام کو اسی جذبہ پر محمول کیا جائے جو اس کا محرک ہوا ہے اور جس کے تعمیری فائدہ کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

ہماری دس سال کی سیاست پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ وہ کس قدر ایک ندی کی پرسکوت روانیوں کی طرح، ہموار اور معتدل رہی ہے۔ نہ اس میں آتش پا جذبات کی تلاطم خیزیاں تھیں کہ جن سے اس کی موجیں اٹھ کر خود اس ساحل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ جس کی آغوش میں انھوں نے پرورش پائی ہو، اور نہ ایسا جمود و تعطل کہ وہ جوئے رواں ایک جوہڑ بن کر رہ جائے۔ نہ اس میں کیا دلی انداز سیاست کی روباہ بازیاں تھیں اور نہ مشرقی مہاتمیت کی "چولہ تبدیلیاں"۔

نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری

سیاست کیا، ایک کشتی رواں تھی جو ہر موجِ سرکش سے بچتی، ہر پرِ خطر چٹان سے کتراتی، خاموشی سے سینۂ آب کو چیرتی، ایک بطِ سیمیں کی طرح متعین منزل کی طرف بایں نمط بڑھے چلی جارہی تھی کہ مسافروں کو کہیں ہچکولا تک نہیں لگتا تھا۔ کوہ کیبنٹ مشن کے پاس سے گذرتے ہوئے اس میں کچھ تزلزل سا محسوس ہوا لیکن یہ جلد ہی سنبھل گئی۔ حتی کہ یہ مونٹ بیٹن کی پرشور وادیوں میں پہنچ گئی جہاں پہلی مرتبہ اس کے بادبانوں میں تھرتھراہٹ کے آثار دکھائی دیئے۔

ہمیں اس حقیقت کا کشادہ ظرفی سے اعتراف کر لینا چاہئے کہ ہماری سیاست، ہندو، مونٹ بیٹن کی حکیمانہ سازش کی حریف نہیں ہو سکی۔ ہم نے چرچل اور اٹیلی، ویول اور پیتھک لارنس تک کی شاطرانہ چالوں کا مقابلہ کیا، لیکن مونٹ بیٹن کا مشفقانہ نقاب بہت دبیز ثابت ہوا۔ یا یوں کہئے کہ جب تک ہماری سیاست اصول و نظریات تک محدود رہی ہم نہایت سلامتی اور متانت سے ہر مخالف قوت کا مقابلہ کرتے رہے لیکن جب معاملہ اس کی عملی تنفیذ کا آیا تو اس میں ہم مات کھا گئے۔

مقامِ ہوش سے آساں گذر گیا اقبالؔ مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ دیوانہ

مونٹ بیٹن، ہندو کی اس سازش کا خمیر ایک لفظ "عجلت" میں تھا۔ تقسیم ہند میں ہندو کو ایک عجلی جلائی دکان

(running Concern) مل رہی تھی۔ ہر چیز اس کے قبضہ میں تھی۔ وہ حکومت کی مسندوں پر براجمان تھا۔ جو کچھ اب آئینی طور پر اس کی طرف منتقل ہونے والا تھا، عملاً پہلے ہی اس کے پاس موجود تھا۔ اسے عجلت سے گھبرانے کی کوئی وجہ ہی نہ تھی۔ اس لئے اس نے فوراً پندرہ اگست کی شرطِ "غیر مؤجل" کو مان لیا اس کے برعکس، مسلمانوں کو ایک نئی حکومت قائم کرنی تھی اور یہ ناممکن تھا جب تک وہ سب کچھ ان کے قبضہ میں نہ آجاتا جو اُن کے حصہ میں آنا تھا اور جو اُس وقت تک عملاً ہندو کے قبضہ میں تھا اس لئے ان کے حق میں اس قدر تعجیل، مرگِ مفاجات تھی۔

ہماری پہلی غلطی یہ تھی کہ ہم نے اس تعجیلی کارروائی پر صاد کیا۔ اس کے بعد جس انداز سے مونٹ بیٹن نے پھڑپھڑاہٹ اور گڑگڑاہٹ پیدا کی ہے اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس مدتِ قلیل میں مسلمانوں کو اس قدر بدحواس کر دینا چاہتا تھا کہ تقسیم کے متعلق ان سے کچھ بن ہی نہ پڑے اور انھیں محض کاغذی ڈگری لے کر اپنے علاقہ کی طرف منتقل ہو جانا پڑے۔ ہم اس فریب کا شکار ہو گئے۔ اس کے بعد کے تمام نتائج اسی کے مآل و عواقب تھے۔ جب ہم علیحدگی کا اصول مان چکے تھے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کی عملی تنفیذ میں اس قدر حواس گم کر دینے والی عجلت سے کام لیا جاتا۔ یہ سب کچھ آہستہ آہستہ ہوتا رہتا اور جون ۱۹۴۸ء تک مکمل ہو جاتا۔ میدانِ مبارزت میں دشمن کی سب سے بڑی چال یہ ہوتی ہے کہ فریقِ مقابل کے اوسان خطا کر دیئے جائیں۔ جن نگاہوں نے گذشتہ جون۔ جولائی (۱۹۴۷ء) کا منظر دیکھا ہے وہ اس پر شاہد ہیں کہ ہمارے اربابِ نظم و نسق کس قدر افراتفری میں تھے اور پندرہ اگست کی تاریخ ان کے پیچھے اس طرح پڑی تھی جس طرح دریا کے کنارے بسنے والوں سے جب کہدیا جائے کہ شام کو سیلاب آئیگا تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ، حواس باختہ، سراسیمہ و بدہوش گم کردہ، کچی پکی سمیٹ کر اٹھ بھاگتے ہیں اور اس سراسیمگی اور حواس باختگی میں جو کچھ وہ پیٹھ پر لاد سکیں اسے غنیمت سمجھ کر جان بچا کر، وقتِ معین سے پہلے چل نکلتے ہیں۔ یہ سیلاب کا چھلاوہ مونٹ بیٹن کی فکرِ فسوں ساز کی اختراع تھا جس میں وہ بڑا کامیاب رہا۔

ہماری دوسری بنیادی غلطی یہ تھی کہ ہم نے بلا تعیینِ حدود، پاکستان کو تسلیم کر لیا۔ ذرا غور کیجئے

ہم نے ایک جداگانہ حکومت تو قائم کر لی لیکن اس کا کچھ فیصلہ ہی نہ کیا کہ اس حکومت کی حدود و ثغور کیا ہوں گی۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہم نے انگریز پر بھروسہ کیا اور اس نے ہم سے بدعہدی کی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انگریز اس قدر قابلِ اعتماد تھا ہی کب؟ جو اس پر اس درجہ بھروسہ کیا جاتا اور بھروسہ بھی اس حد تک کہ اس کے فیصلے کے ردو قبول کے حق سے بھی اپنے آپ کو محروم کر لیا جاتا؟ حدود کا مسئلہ کوئی جزئی یا فرعی مسئلہ نہ تھا وہ بنیادی اور اصولی مسئلہ تھا۔ ہمارا مطالبہ یہ کبھی نہ تھا کہ ہندوستان کے جتنے گوشے میں ہندو یا انگریز چاہے ہمیں علیحدہ حکومت کا حق دیدے۔ ہمارا مطالبہ شروع ہی سے یہ تھا کہ جن علاقوں میں ہم اکثریت میں ہیں انہیں ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ ان علاقوں کی تعیین کے متعلق یا تو وہ ہمارا اصول تسلیم کرتے اور اور اگر وہ اس پر رضامند نہ تھے تو پھر کھلے بندوں اس کا فیصلہ ہوتا۔ بہر حال، کسی صورت میں فیصلہ ہوتا، یہ فیصلہ تقسیم سے پہلے ہونا چاہیے تھا تاکہ مشکوک یا متنازعہ فیہ علاقے کے مسلمانوں کو علم ہوتا کہ ان کا مستقبل کن سے وابستہ ہوا ہے۔ کس قدر قیامت تھی کہ گورداسپور، جالندھر، فیروزپور وغیرہ کے مسلمان حصولِ آزادی پر جشنِ مسرت منا رہے تھے کہ ان پر مرگِ ناگہانی کی طرح یہ بجلی آسمان سے آگری کہ وہ انگریز کی غلامی سے نکل کر ہندو قوم کی غلامی کے شکنجے میں جکڑ دیئے گئے ہیں۔ یہ فیصلہ اس قدر ناگہانی اور غیر متوقع تھا کہ وہ نفسیاتی طور پر اسے قبول کرنے کے لئے آمادہ ہی نہیں تھے۔ ہم پر جس قدر قیامتیں بعد میں ٹوٹی ہیں ان کا ایک بنیادی سبب بلا تعیینِ حدودِ پاکستان کا قیام تھا۔

ہماری تیسری بنیادی غلطی یہ تھی کہ ہم نے افواج و عساکر اور سامان و آلاتِ حرب و ضرب کی تقسیم کے بغیر جداگانہ سلطنت قائم کر لی۔ یوں تو شروع ہی سے اصولِ جہانبانی اسی انداز کا چلا آرہا ہے کہ حکومت کی بنیاد و اساس قوت پر ہوتی ہے۔ لیکن اس زمانہ میں اس مسئلہ نے اور بھی اہمیت حاصل کر رکھی ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ ہر جنگ کے بعد، سب سے پہلا سوال یہ پیش ہوتا ہے کہ مختلف اقوام کے پاس کس کس تناسب سے جیوش و عساکر اور سامانِ جنگ ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد ہر قوم کی نگاہ اضطراب دوسری اقوام کی عسکری قوتوں پر رہتی ہے۔ جو قوم اس باب میں ذرا چوک جاتی ہے فوراً دبوچ لی جاتی ہے

ہندوستان کے اندر چھوٹی چھوٹی ریاستیں، جنھیں کبھی حق خود اختیاری حاصل نہیں ہوا تھا وہ بھی کچھ نہ کچھ فوجی قوت رکھتی ہیں۔ لیکن ہم نے کرۂ ارض پر پانچویں بڑی سلطنت قائم کی اور اپنی عسکری قوت، فریقِ مخالف کے قبضہ میں چھوڑ دی۔ ہندو کو معلوم تھا کہ پاکستان کے پاس اپنی حدود کی محافظت کے لئے بھی کافی سامان اور قوت نہیں ہے۔ اس لئے وہ بات بات پر ہمارے سامنے آستین چڑھاتا تھا۔ ہماری یہی بنیادی کمزوری تھی جس کی وجہ سے ہمیں اس قدر ملی نقصان اٹھانا پڑا۔ اور یہ بھی درحقیقت اُسی عجلت کا نتیجہ تھا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

سامانِ حرب ہی نہیں ہم تو اپنا نقد روپیہ بھی اُنہی کے ہاں چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ اس روپے کی بازیابی میں ہمیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ ظاہر ہیں۔ بنئے سے پیسہ لینا آسان کام نہیں۔ اس کی تجوری میں اپنا پیسہ رکھنا ہی غلط تھا اور اس سے بر وقت وصول نہ کر لینا غلط تر!

ان اساسی اسقام و تسامح کو چھوڑ کر اب نظم و نسقِ حکومت کی طرف آئیے۔ اربابِ حکومت میں اوپر وہ طبقہ تھا جو عبوری حکومت کے زمانہ میں مسانیدِ اقتدار پر متمکن کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ انھیں نظم و نسقِ حکومت کا چنداں تجربہ نہ تھا۔ انگریزوں کے رواں نظام میں صورت یہ تھی کہ جس کسی کو جہاں بٹھا دیجئے وہ کام چلا لیتا تھا۔ لیکن خود اپنا نظام متعین کر کے اسے رواں کرنا تو ہر ایک کا کام نہ تھا۔ تقسیم کے زمانہ میں ہماری اس ناتجربہ کاری نے ہمیں سخت نقصان پہنچایا۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جو پہلے سے ملازمتوں میں چلا آرہا تھا۔ انھیں نسبتاً تجربہ حاصل تھا لیکن ان کے لئے ایک اور دقت تھی۔ انگریزی مشینری میں مسلمان ملازمین مختلف پرزوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ کوئی یہاں، کوئی وہاں، ایک تو تعداد میں کم دوسرے ہندو کی گہری حکمتِ عملی کے ماتحت، ایسے مقامات پر نصب شدہ، جہاں اُنھیں حکومت کے حقیقی نظم و نسق میں چنداں اہم حیثیت حاصل نہ تھی۔ تقسیم کے وقت یہی پرزے اِدھر اُدھر سے نکل کر یکجا کر دیئے گئے۔ یہی مشینری کے اندر تو یہ اپنے اپنے فرائضِ مفوضہ کی سرانجام دہی کر سکتے تھے لیکن از خود ایک مکمل مشینری تو نہیں بن سکتے تھے۔ لیکن ہماری مشینری انہی کے مجموعہ کا نام تھی

ایک تو مشینری ایسی ناتمام پھر اسے اس برق رفتاری سے کام کرنا پڑا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ چنانچہ اس باب میں ایسے ایسے نقائص و اسقام رونما ہوئے جن کا خمیازہ اس وقت تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔

سب سے پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ ملازمین میں سے کس کس کو پاکستان لے جایا جائے۔ اس کا سہل ترین اور اطمینان بخش جواب یہ تھا کہ جس جس کی ضرورت ہو اسے لے جایا جائے۔ لیکن اس کیلئے پہلے اپنی ضروریات کا متعین کرنا ضروری تھا۔ اس کے لئے فرصت، محنت اور اہلیت درکار تھی۔ فرصت تو واقعی کم تھی لیکن بایں ہمہ اگر اسی تناسب سے محنت زیادہ کر لی جاتی تو ہمارا خیال ہے کہ یہ کچھ ایسا ناممکن مرحلہ نہ تھا لیکن ایسا نہ کیا گیا اور اس کی آسان صورت یہ سمجھی گئی کہ اعلان کر دیا جائے کہ

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

ہر شخص جو پاکستان جانا چاہے چلا جائے۔ عہد جنگ کے زمانہ میں دفتری ضروریات بہت بڑھ گئی تھیں ان کیلئے عملہ بھی بے شمار رکھنا پڑا تھا۔ جنگ کے بعد خود حکومتِ ہند کو بھی اس جمِ غفیر کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ انہیں تخفیف میں لانے کی فکر میں تھی۔ پھر زمانۂ جنگ میں عملہ کے لئے معیارِ انتخاب بھی ایسا ہی تھا۔ اس پستیٔ معیار سے پیدا شدہ استعداد کی کمی کو تعداد کی زیادتی سے پورا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان عارضی ملازمین کی تخفیف ضروری تھی اور انہیں ملازم بھی اسی شرط پر رکھا گیا تھا۔ اب جو انہوں نے بابِ پاکستان کو اس طرح کھلا دیکھا، تو ہر شخص اس میں داخل ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ عملہ ضرورت سے کہیں زیادہ ہو گیا اور استعداد کے اعتبار سے معیار سے کہیں نیچے۔ یہ ہجوم و انبوہ اس طرح جانبِ پاکستان روانہ ہوا جیسے تماشائی کہیں میلہ دیکھنے جا رہے ہوں۔ یہاں پہنچے تو دفتر کے لئے جگہ نہیں، رہنے کے لئے مکان نہیں، بیٹھنے کے لئے میز کرسی نہیں، لکھنے کے لئے کاغذ یا قلم دوات نہیں۔ حسبِ سابق کام کرنے کیلئے پچھلا ریکارڈ نہیں۔ از خود کام کرنے کے لئے پوری مشینری نہیں اور اگر مشینری ہے تو ذہنوں میں جدتِ افکار نہیں دلوں میں ولولۂ کار نہیں۔ عام حالات میں بھی، خوئے بدرا بہانہ بسیار۔ اور اب تو بہانے بھی بنے بنائے سامنے رکھے تھے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ "بیکار دماغ شیطان کی کارگہ بن جاتا ہے"، بالکل درست ہے۔ ان بیکار دماغوں نے اس اس قسم کے مظاہرے کئے جن کی یاد سے روح شرما جاتی ہے۔ ہر شخص کو یہ فکر جولاں ہے

کی نال بنائے ہوئے تھی کہ اس تنظیم نو میں مجھے کیا ملتا ہے! یوں معلوم ہوتا تھا گویا پاکستان، مالِ غنیمت کا انبار ہے جس کے حصے بخرے ہو رہے ہیں اور ہر شخص کو اپنے اپنے حصے کی فکر ستا رہی ہے۔ ایک لاش ہے جس پر چاروں طرف سے گدھ منڈلا رہے ہیں۔ ذہنوں میں نقشے بنتے ہیں تو اسی کے لئے۔ دماغوں میں اسکیمیں تیار ہوتی ہیں تو اسی کی خاطر۔ دن بھر دوڑ دھوپ ہو رہی ہے تو اسی مقصد کے پیشِ نظر۔ ہاتھ کی تیری توے کی میری۔ ایک عجیب افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم ہے۔ وہ یہ بن گیا۔ مجھے یہ کچھ بننا چاہئے۔ اس تگ و تاز میں بہتوں کی بن آئی۔ ان کے لئے پاکستان کیا بنا ڈربی کی لاٹری نکل آئی۔ جو وہاں کسی قطار شمار میں نہ تھے، یہاں سب سے معتبر بن گئے۔ حکومت کی مشینری چلے یا نہ چلے، ان کی بلا سے۔ انھیں تو مناصبِ بلند اور مدارجِ رفیع الشان حاصل ہو گئے۔ وذالک الفوز العظیم۔

حقِ انتخاب کو استعمال کر کے پاکستان آنیوالے طبقہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک وہ جو مرکزی حکومت کے دفاتر (دہلی) میں ملازم تھا اور دوسرا وہ جو ہندوستان کے اطراف و جوانب میں پھیلا ہوا تھا (مثلاً ریلوے اور ڈاکخانے وغیرہ کے ملازمین) اول الذکر طبقہ کراچی پہنچ گیا۔ جو حکومتِ پاکستان کا صدر مقام قرار پایا تھا۔ اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بیشتر اسی عملہ سے متعلق ہے۔ ثانی الذکر بے چارہ عجیب پریشانیوں میں مبتلا رہا۔ (اور ابھی تک ہے) ذرا غور کیجئے کہ لاکھوں کی تعداد میں عملہ اور اس کے متعلقین، ملک کے دور دراز گوشوں میں بکھرا پڑا ہے۔ حقِ انتخاب کے بعد وہاں کی حکومت نے انھیں برطرف کر دیا (حالانکہ معاہدہ کی رُو سے انھیں بتدریج منتقل کیا جانا تھا) اب وہ اُن کی نگاہوں میں یکسر دشمن بن گئے۔ لہٰذا وہاں رکنا ناممکن۔ حکومت پاکستان کی طرف سے ان کی تعیناتی کے متعلق کوئی احکام نہیں پہنچے لہٰذا وہ جائیں تو کدھر جائیں۔ اور اگر احکام بھی پہنچ گئے ہوں تو پاکستان کس طرح آئیں۔ ملک غیروں کا، وسائل آمد و رفت سب اُن کے قبضے میں۔ اِن کے ساتھ اُن کا رویہ یکسر معاندانہ۔ اب ان غریبوں کو کچھ معلوم نہیں کہ کریں تو کیا کریں۔ بیچارے بال بچوں کو ساتھ لئے مارے مارے پھر رہے ہیں لیکن کہیں گوشۂ عافیت نہیں۔ کوئی مامن و مسکن نہیں، کچھ راستوں میں مارے گئے۔ کچھ پناہ گزینوں کے کیمپ میں تباہ ہو گئے۔ جو ہزارہا مشکلات و صعوبات کے بعد پاکستان پہنچ گئے ان کے لئے رہنے کو مکان نہیں، خرچ کے لئے پیسے نہیں، کرنے کے لئے کام نہیں۔ عجیب پریشانی اور بے سروسامانی ہے۔ حکومت انھیں

تنخواہیں دے یا پناہ گزینوں کے زمرہ میں شامل کرکے ان کی ضروریات کی کفیل بنے۔ اخراجات کا بار بہرحال اٹھانا ہے۔ چھ مہینے ہوگئے فالتو اخراجات کے اس بوجھ سے حکومت کی کمر ٹوٹ رہی ہے اور عملہ اور اس کے متعلقین پریشانیوں اور مصیبتوں کے ہاتھوں الگ تباہ ہو رہے ہیں اور یہ سب اس لئے کہ آنے سے پہلے یہ نہ سوچ لیا گیا کہ ضرورت کے مطابق عملہ ساتھ لانا چاہیے۔ اور پھر یہاں پہنچنے کے بعد اس وقت تک یہ نہ فیصلہ کیا جا سکا کہ اب جو انھیں اس طرح یہاں لایا گیا ہے تو انھیں سنبھالا کس طرح سے جائے!

کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس تمام عملہ کو ساتھ نہ لایا جاتا تو بھی یہ پناہ گزینوں کی حیثیت سے یہاں آجاتا۔ جیسا کہ وہ تمام عملہ یہاں آگیا جنھیں حقِ انتخاب نہیں دیا گیا تھا۔ لیکن بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اس فاضل عملہ میں جسے حقِ انتخاب دیکر ساتھ لایا گیا ہے اور اس عملہ میں جو پناہ گزینوں کی صورت میں آیا ہے زمین آسمان کا فرق ہے۔ اول الذکر عملہ تمام مراعات بطور استحقاق مانگتا ہے اور اگر ان میں کسی قسم کی کمی کا سوال پیش ہوتا ہے تو آنکھیں دکھانے لگتا ہے۔ ثانی الذکر احساناً امداد کی درخواست کرتا ہے اور اسے جو کچھ مل جائے اسے غنیمت سمجھتا ہے۔ لہٰذا کام بھی اچھا کرتا ہے اور مطمئن بھی ہو جاتا ہے۔ اس احساسِ استحقاق نے عملہ میں عجیب کیفیت پیدا کر رکھی ہے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر عارضی ملازمین تھے جنھیں جنگ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے ماتحت ملازم رکھ لیا گیا تھا۔ ان کی ملازمتیں یکسر عارضی تھیں اور مشروط بایں شرط کہ حکومت جب چاہے گی ایک ماہ کا نوٹس دے کر انھیں برطرف کر دے گی۔ انھیں شرائط کو برقرار رکھتے ہوئے انھیں پاکستان لایا گیا لیکن پاکستان پہنچنے کے بعد ان کی یہ کیفیت ہوگئی کہ گویا انھوں نے پاکستان کی ہفت پشت ہفتاد نسل پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ بات بات پر روٹھ رہے ہیں۔ کام کرکے نہیں دیتے اور ہر وقت دھونس جمانے کی فکر دامن گیر رہتی ہے سرکشی اور ضوابط شکنی کا نام ان کے نزدیک آزادی ہے۔ چنانچہ بتایا جاتا ہے کہ کام کا معیار اس قدر گر گیا ہے کہ شاید سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے زمانہ میں بھی ایسی صورت نہ پیدا ہوئی ہوگی۔ سست رفتاری کا یہ عالم ہے کہ اصحابِ کہف کی طرح تحسبھم ایقاظاً وھم رقود (تو انھیں جاگتا ہوا سمجھتا ہے حالانکہ وہ سو رہے ہیں) پاکستان عملاً جنگ میں سے گذر رہا ہے لیکن ان کی یہ حالت ہے کہ

ہوئی لاکھ دنیا اِدھر کی اُدھر سے ۔۔۔ وہی سنگِ در ہے وہی اپنا سر ہے

ان میں یقیناً ایسا عملہ بھی ہے جن کا یہ اعتراض درست ہے کہ ہمیں حقِ انتخاب دے کر پاکستان لایا کیوں گیا۔ ہم وہاں رہتے تو جو کچھ ہم پر گذرتی ہم جھیل لیتے۔ یہاں لانے کے بعد اب ہم سے اس طرح کا سلوک کیا جا رہا ہے غرضیکہ ایک طرف حکومت اس فاضلہ عملہ کی وجہ سے نظم و نسق کی ابتری اور اخراجات کی زیادتی کی مصیبت میں مبتلا ہے اور دوسری طرف عملہ، شکوہ سنج ہے کہ "بلغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں"؟ اس پریشانی میں جہاں ایک طرف ہزارہا عملہ کو مفت کی تنخواہیں دی جا رہی ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں ان کے جائز اور واجب مطالبات بھی نہیں دیئے جاتے۔ ایسی ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ لوگ باقاعدہ کام کر رہے ہیں لیکن چھ چھ ماہ سے انہیں تنخواہیں نہیں ملیں۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ فاضلہ عملہ خود اور ان کے بعض بہی خواہ بھی یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اس عملہ کو فالتو قرار دے کر نکالا نہ جائے۔ بسوختِ عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است۔ یہ جذبہ محدود اور ذاتی اغراض کا آئینہ دار ہے اور بس۔ عملہ متعلقہ کے نزدیک حکومتِ پاکستان کی "افادیت" کا دارومدار اس سوال کے جواب پر ہے کہ "مجھے کیا ملتا ہے"؟ یعنی مملکتِ پاکستان کے حصول پر جس شخص کو کوئی منصب بلند مل گیا، یا اس کے لئے کوئی اور ذاتی منفعت کی صورت نکل آئی تو بھر تو اس کے نزدیک پاکستان بجا اور درست اور اس کا قیام مفید و پر منافع۔ اور جس شخص کو اس "لوٹ کھسوٹ" سے کچھ حصہ نہیں ملا اور وہ اسی حال پر رہا جس پر قیامِ پاکستان سے پیشتر تھا یا اس ہنگامہ میں اسے ذاتی نقصان (لفظ "ذاتی" کو خصوصیت سے نگاہ میں رکھئے یہی ہماری تنقید کی اساس بن گئی ہے اور یہی ہمارے ملی امراض کی علت العلل ہے) اٹھانا پڑا تو اس کے نزدیک پاکستان مذموم و مردود۔ فاضلہ عملہ کیوں بدستور سرکاری ملازمت سے چپکا رہنا چاہتا ہے؟ آپ اس سوال کے جواب کی سنجیدہ تلاش کیجئے گا تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کتنی خطرناک بیماری کی علامت ہے۔ یہ وہی دیرینہ بیماری ہے جس کے اب تک ہم شکار چلے آئے ہیں۔ یہ ذہنیت ہمیں ورثہ میں ملی ہے اور ہماری تربیت کا جزوِ غالب یہی ہے کہ سرکاری ملازمت آبرومندانہ ذریعۂ معاش ہے اور اس کے علاوہ دیگر صنعتی اور تجارتی ذرائع معاش عزت بخش نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اب حکومت ہماری اپنی ہے لہٰذا ہم پر اس کی خدمت فرض ہے۔ لیکن غور سے دیکھئے کہ خدمتِ حکومت کا صرف ایک ہی ذریعہ تو نہیں۔ اس کے متفرق ذرائع ہیں۔

آپ ساری "قوت" اسی ایک محاذ پر ہی کیوں مجتمع کر رہے ہیں؟ اس طرح آپ دوسرے اہم محاذوں کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ آپ ضرورتِ قومی کا بہ حیثیتِ کل مطالعہ کیجئے اور اس کوتاہ نظری کو ترک کیجئے۔

یہ اُس دورِ غلامی کی ذہنیت ہے جب ہمارے آقاؤں کو اپنی ضروریات کے لئے ہمیں تیار کرنا مقصود تھا لیکن وائے بدبختی! ہم ملازمت کے کولھو میں ایسے جُتے کہ اقتصادیات کی لامحدود فضاؤں میں تلاشِ رزق کرنے کیلئے اس چکر سے نکل ہی نہیں سکے۔ اپنے آپ کو سرکاری ملازمتوں تک محدود کر دینے کے نتائج ہم برسوں سے بھگت رہے ہیں۔ لیکن تقسیم نے ان نتائج کو اور بے پناہ اور اشد بنا دیا ہے۔ غیر مسلم تاجروں کے ترکِ پاکستان پر ہمارے تجارتی و صنعتی ادارے بیکار پڑے ہیں۔ ان کے چلانے کیلئے نہ معلوم تجربہ میسر ہے نہ اہلیت۔ اس نقلِ مکانی سے تجارت میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسے ہمیں فی الفور پر کرنا چاہیئے۔ جب تک یہ خلا باقی ہے ہمارا نظامِ حکومت و معاشرت مکمل نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے آسمان سے فرشتے نہیں اتریں گے بلکہ خود مسلمانانِ پاکستان کو شبانہ روز محنت سے ان راہوں پر چلنا ہو گا جن سے وہ اب تک دور رہے ہیں۔ انھیں ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہو گا جنھیں ابھی تک غلامی نے خوابیدہ رکھا اور جو کہ ہمارے محن و مصائب کھود کھود کر کامرانیوں کی جوئے شیر بہا دینے کی ضامن ہیں۔ لیکن اس وقت ہم اس غیر معمولی محنت کر گھبرا رہے ہیں۔ ہم اس اجنبیت سے خائف ہیں جو ان غیر مانوس راہوں پر چلنے سے ہمیں محسوس ہو گی۔ الغرض ہم ممکناتِ زندگی کا گلا دبائے رکھنا چاہتے ہیں۔ زندگی کا جو فوارہ آزاد اقوام کے اعماقِ قلب سے پھوٹتا ہے ہم اس کے منبع کو بند کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم انہی آسان، پامال راہوں پر چلنے پر مصر ہیں جن کی ہمیں عادت ہو گئی ہے۔ یہ ہے اصل جذبۂ محرکہ اس مطالبہ کا کہ فالتو عملہ کو ملازمتوں سے الگ نہ کیا جائے۔ لیکن ذرا اس حقیقت کو سامنے رکھئے کہ حکومتِ پاکستان کوئی بیرونی ادارہ نہیں، وہ ہماری اپنی حکومت ہے۔ میری، آپ کی۔ خدارا حکومت کو غیر نہ سمجھئے۔ یہ خارجی ادارہ نہیں، یہ آپ کا قائم کردہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ کو اس کی ترکیب اور فعالیت پر شدید اعتراضات ہیں۔ لیکن صحیح راہِ عمل اس کی تخریب نہیں، بلکہ اس کی اصلاح ہے۔ آپ اس پر جو ناجائز بار ڈالیں گے اس سے آپ کی کمر ٹوٹے گی۔ کہا جا سکتا ہے کہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر باشندہ مملکت کے لئے "جیب دکم" (قیام و طعام) کا انتظام کرے۔ بہ درست، لیکن اس کی تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ

حکومت ایک دیتیم (بیکار) خانہ' یا انجمن بیکاراں کی منصرم بن جائے اور ارکانِ انجمن کے وظیفے مقرر کر دے۔ اس سے فاضلہ عمل کی عدمِ تخفیف کا جواز نہیں نکلتا۔ یہ ایک عمومی مسئلہ بن جاتا ہے۔ مناسب و صحیح الفاظ میں قوم کے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ اس قومی افتاد نے ہزاروں لاکھوں افراد قوم کو جس بے رحمی سے پامال کیا ہے انھیں پھر سے کیسے اپنے پاؤں پر کھڑا کیا جائے۔ قوم کو (بشمول حکومت) یہ مسئلہ پوری ذمہ داری اور کمالِ تدبر سے حل کرنا چاہیے قوم میں جتنے بیکار لوگ ہیں انھیں جہاں تک ممکن ہو موجودہ اداروں میں کھپانا چاہیے۔ اگر موجودہ ادارے کافی نہ ہوں تو نئے وسائلِ معاش تلاش کرنے چاہئیں۔ قیامِ پاکستان نے قوم کے سامنے متعدد نئی راہیں کھول دی ہیں مگر ان کار اپنی صلاحیتوں کا جائزہ لے کر اور اپنے میلانات وغیرہ کا پاس کر کے ان راہوں پر گامزن ہونے کے بجائے "منتظرینِ فردا" ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ ان میں عمل کے آثار ہیں تو صرف یہ کہ حکومت نا اہل ہے، فلاں گردن زدنی ہے۔ ومن ذالک الھفوات۔

ہم حکومت کی وکالت نہیں کر رہے۔ اس کے عدمِ تدبر اور فقدانِ مآل اندیشی کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے لیکن جمہوری آئین کے مطابق، جس پر کاربند ہونے کا ہم سب حکومت دعویٰ کرتے ہیں۔ کوئی حکومت ناقابلِ تبدیل نہیں ہوتی۔ آپ آئینی طور پر اپنی قوتیں مجتمع کر کے نا اہل و ناقابلِ برداشت حکومت کو بدل سکتے ہیں اور اس کے بجائے فریضۂ حکومت بہتر افراد قوم کے سپرد کر سکتے ہیں۔ آپ موجودہ حکومت سے مطمئن نہیں تو آئینی جدوجہد سے اس کی اصلاح (یا تبدیلی) کے لئے کوشش کیجئے۔ لیکن خدا کے لئے اس کی حقیقی یا موہوم خامیوں کو مبالغہ آمیزی سے پیش کر کے اپنی خامیوں کو نظر انداز کر دینے کی خود فریبی سے بچئے یہ صریح فریبِ نفس ہے۔ آپ اس حقیقت کو کبھی نہ بھولئے کہ اچھی بالائی صرف اچھے دودھ پر آسکتی ہے۔ نا اہل حکومت نا اہل قوم کی تخلیق ہوتی ہے۔ موجودہ حکومت قوم کا عکس ہے۔ ایک کی نا اہلیت دوسرے کی نا اہلیت کی مستلزم ہے۔

ان حالات میں حکومت سے یہ مطالبہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو ضروری مراعات دے۔ جو صنعت و حرفت کی طرف توجہ دینے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ہم جس بے روزگاری کے خوف سے سہمے ہوئے ہیں اور جو دن بدن پھیل رہی ہے اس کا واحد علاج یہ ہے کہ فرسودہ اور روایتی راہوں کو چھوڑ کر نئی فضاؤں میں پُرفشانی کی جائے تاکہ ملک اور قوم دونوں کا بھلا ہو۔

اس صلائے عام سے صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ ضرورت سے زیادہ عملہ ساتھ آگیا بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر ایک اور خرابی بھی پیدا ہوگئی۔ اور یہ خرابی ایسی ہے جو پاکستان کے پورے کے پورے نظام کی تخریب کا موجب بن سکتی ہے۔ زائد از ضرورت عملہ سے تو اقتصادی نقصان ہی پہنچا لیکن اس دوسری خرابی کے نتائج ایسے دور رس اور تباہ کن ہوں گے کہ اگر اس کا کچھ قرار واقعی مدافعہ نہ کیا گیا تو حکومت پاکستان کا قصرِ نو تعمیر بنیادوں سے ہل جائیگا۔

حکومتِ ہند میں اکثر مسلمان ایسے تھے جو عمر بھر تحریک پاکستان کے مخالف اور مسلم لیگ کے دشمن رہے۔ یہ قومیت پرست گروہ، تمام دورِ تر میں پاکستان اور لیگ کے خلاف منافرت کا زہر پھیلاتا رہتا تھا اور اپنے آقایانِ نعمت (ہندوؤں) کی قومیت کے گھنڈ پر مسلمانوں کے محبوب ترین قائدین کو ہدفِ طعن و تشنیع تک بنانے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ سنتے ہیں کہ وہاں ایسے مناظر اکثر سامنے آجاتے تھے کہ ایک ہندو نے مسلم لیگ اور اس کے داعیات و مطالبات کے خلاف سلسلۂ جنبانی کی اور اس کے بعد ان نیشنلسٹ مسلمانوں ہی سے ایک نے یہ سررشتہ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس پر وہ ہندو تو خاموش ہوگیا اور ان حضرات نے مسلمانوں کے خلاف ایسا زہر اگلنا شروع کر دیا جس کی جرأت خود ہندو بھی نہ کرتا۔ اور اگر اس کے جواب میں کوئی لیگی مسلمان کچھ کہنا چاہتا تو ہندوؤں کی طرف سے (جو اکثر بالادست ہوتے تھے) یہ کہہ کر اسے خاموش کرا دیا جاتا کہ دفتر میں پالیٹکس کے متعلق بحث و تمحیص نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ نیشنلسٹ مسلمان، اپنے ہم مشرب اکابرین (مثلاً ابوالکلام صاحب آزاد وغیرہ) سے اکثر روابط قائم رکھتے اور انہی کے ایماء سے کانگرس کی پراپیگنڈا ایجنسی کی حیثیت سے کام کیا کرتے۔ مسلمان ان آستین کے سانپوں کے ہاتھوں سخت نالاں تھے۔ حصولِ پاکستان کے بعد یہ امکان نظر آتا تھا کہ اب قوم، ان غدارانِ ملت کی روباہ بازیوں سے مخلصی حاصل کر لیگی۔ لیکن اس "صلائے عام" سے یہ ہوا کہ یہ تمام قومیت پرست عنصر، پاکستان آپہنچا اور دفاتر میں مختلف کرسیوں پر متمکن ہوگیا۔ اب سنتے ہیں کہ یہی "رکنِ پنجم" (Fifth Column) حکومتِ پاکستان کی مشینری میں معتبر اور معتمد علیہ بنے ہوئے ہیں اور چونکہ ان پاکستانی ملازموں کو پہلے سے اس امر کی ضمانت دیدی گئی تھی کہ ان کے جملہ حقوقِ ملازمت محفوظ رہیں گے اس لئے یہ گروہ منافقین، خنجر در آستین، اپنی زہر افشانیوں میں بدستور مصروف ہے۔ ہم تو اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہاں بدعنوانیوں اور سرکشیوں کے جو مظاہرے ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اکثر و بیشتر اسی

گروہ کی انگیخت کا نتیجہ ہوں گے۔ یہ گروہ اپنے ساتھ ایک خاص مقصد لے کر آیا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہر وقت مصروفِ کار رہتا ہے۔ کبھی ناصحینِ مشفق کے لباس میں اور کبھی ناقدینِ مصلح کے نقاب میں، یہ لوگوں کے حوصلوں (Morale) کو پست کرنے اور ٹھنڈی آہیں بھر بھر کر انھیں پاکستان اور اس کے اربابِ حل وعقد کے خلاف ورغلانے اور بھڑکانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔ دنیا میں ہر ملازم رکھنے والے کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ صرف اس شخص کو ملازم رکھے جس پر اسے پورا پورا اعتماد ہو اور جو اس کے کاروبار اور نظم ونسق کو نقصان پہنچانے کا موجب نہ ہو۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق تمام حکومتیں، صرف ان لوگوں کو شریکِ کار بناتی ہیں جن کے احوال وجوانب اور میلانات وعواطف کی انھوں نے چھان بین کر لی ہوتی ہے لیکن یہاں یہ ہوا ہے کہ وہ لوگ جن کے متعلق برسوں کے عینی مشاہدہ نے بتا رکھا تھا کہ یہ پاکستان کے پکے دشمن ہیں ان سب کو بلا تخصیص شاملِ دفاترِ حکومت کر لیا گیا ہے اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ نہایت ذمہ داری کے کام اُن کے سپرد ہیں اور چونکہ ان کے حقوقِ ملازمت کے تحفظ کی بھی ضمانت دیدی گئی ہے اس لئے وہ بے خوف وخطر اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف رہ سکتے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ نیک نیتی سے نیشنلزم (پاکستان کے خلاف) عقیدہ رکھتے ہیں اور حکومت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ان کے عقیدہ کی آزادی کو سلب کرلے۔ بجا اور درست! لیکن یہ تو فرمائیے کہ اگر اس قسم کے سیاسی عقائد کا اختلاف ایسا ہی معصوم ہے تو گذشتہ دس برس کی سیاسی جدوجہد میں آپ "نیشنلسٹ مسلمانوں" کو ملت کے بدترین دشمن کیوں قرار دیا کرتے تھے؟ وہ نہایت نیک نیتی سے ایسا عقیدہ رکھتے تھے لیکن بایں ہمہ آپ نے انھیں کبھی اس بنا پر بھی خواہ ملت قرار نہیں دیا کہ ان کا عقیدہ نیک نیتی پر مبنی ہے۔ سو اگر یہ لوگ، باوصف نیک نیتی، دشمنانِ ملت قرار دیئے جاتے تھے تو دفاتر میں یہی لوگ کس طرح یہی خوابانِ قوم ثابت ہوں گے! ذرا سوچئے کہ اگر آج ابوالکلام صاحب آزاد اپنے موجودہ عقائد کو برقرار رکھتے ہوئے چاہیں کہ آپ کی وزارت میں شریک ہو جائیں تو کیا آپ اس کی اجازت دیں گے؟ شریکِ حکم کرنا تو ایک طرف، آپ تو اختلافِ عقیدۂ سیاسی کی بنا پر اسے مسلم لیگ کا دو آنہ کا ممبر بھی نہیں بنائیں گے، اور یہ بالکل بجا اور درست ہے۔ اور پھر اختلاف کی نوعیت پر بھی تو غور کیجئے۔ آپ نے پاکستان کی سلطنت اس

بنا پر قائم کی ہے کہ آپ کے نزدیک مسلمانوں کے لئے جداگانہ حکومت کا قیام نہایت ضروری ہے اور یہ لوگ نہایت نیک نیتی سے عقیدہ رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ قومیت کا تصور اور علیحدہ حکومت کا قیام مذہباً ناجائز اور سیاسی طور پر سخت تباہ کن ہے۔ کہئے کہ اس قسم کے عناصر کو حکومت کی مشینری کے اجزا بنالینا خودکشی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ ہے وہ تباہ کن خرابی جو اس "ملائے عام" سے پیدا ہوئی۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے عام زائد از ضرورت عملہ کا نقصان عارضی ہے اور اس کا دائرہ نفوذ اقتصادی۔ لیکن ان مارہائے آستین کی پرورش اور نظامِ حکومت میں ان کا عمل دخل، ایک مستقل خطرہ ہے اور اس کے نتائج وعواقب ہمہ گیر۔ اگر عام زائد از ضرورت عملہ کا بوجھ، اس حادثہ کی طرح ہے جس سے کسی کو زخم آجائے تو اس "ففتھ کالم" عنصر کا وجود تپ دق کے جراثیم کے مثل ہے، اول الذکر کچھ عرصہ کی تکلیف اور علاج کے بعد مندمل ہو سکتا ہے لیکن اگر اس آخر الذکر کی مدافعت کا سامان فوری طور پر نہ کیا گیا تو اس سے جانبر ہونا ناممکن ہو جائے گا۔

پھر ایک بہت بڑی غلطی یہ تھی کہ عملہ، سامان، ریکارڈ، سب کچھ دہلی رہا اور اراکینِ حکومت اور حکامِ بالا، سب کراچی پہنچ گئے۔ نتیجہ یہ کہ جب وہاں فسادات کی وجہ سے انتشار پیدا ہوا ہے تو وہاں کی ہر شے کس مپرسی اور لاوارثی کی حالت میں رہ گئی۔ اگر ہماری حکومت کے اربابِ حل وعقد وہاں موجود ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ حکومت ہند ہمارے عملہ اور متعلقات سے اس قسم کا کس مپرسانہ سلوک کرتی۔ اگر یہ پہلے کراچی آ بھی گئے تھے تو وہاں کی خلفشار کی اطلاع پاتے ہی انہیں فوراً موقع پر پہنچ جانا چاہئے تھا۔ اس طرح ضیاعِ نفوس واموال میں اس قدر شدت نہ ہوتی۔ اس باب میں صرف دہلی اور کراچی کا ذکر کیا۔ مشرقی پنجاب میں بھی جب فسادات شروع ہوئے ہیں تو مسلمانوں کے بڑے بڑے اکابر (الا ماشاء اللہ) سب وہاں سے پہلے ہی فرار ہو چکے تھے اور عوام بیچارے بیکس مپرسی اور مظلومیت کی حالت میں رہ گئے تھے۔ عوام نے حوصلے نہیں ہارے لیکن انہیں کوئی بتانے والا نہیں تھا کہ وہ کیا کریں اور کہاں جائیں۔ ہمارے نقصان (اور ایسا نقصان کہ جس کی تلافی صدیوں تک نہیں ہو سکتی) کا بیشتر حصہ محض اس وجہ سے وقوع پذیر ہوا کہ عوام بے چارے بھیڑیوں کے پنجے میں لاوارث چھوڑ دیئے گئے تھے اور اس سراسیمگی اور حواس باختگی کے عالم میں انہیں کچھ سوجھتا نہیں تھا کہ کیا کریں اور کسے پکاریں

ان کی بیکس نگاہیں بار بار اپنے اکابرین و قائدین کو تلاش کرتی تھیں اور خاسر و ناکام گوشۂ چشم میں واپس جاتی تھیں اگر اکابرین اس آزمایش میں ذرا ہمت سے کام لیتے اور وہیں ڈٹے رہتے تو عوام کے حوصلے بندھے رہتے، ان کی تنظیم قائم رہتی اور اس طرح بھاگڑ میں بن آئی موت نہ مرتے۔ عوام کی نفسیاتی کیفیت عجیب ہوتی ہے۔ بھرے میلے میں کہیں ایک طرف سے "آگئے آگئے" پکار دیجئے، پھر دیکھئے کس طرح بھاگڑ مچتی ہے۔ کسی پُرسکون مجمع میں ایک چوہا چھوڑ دیجئے۔ دیکھئے کس قدر خلفشار و انتشار واقع ہو جاتا ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی مرکزی شخصیت انھیں بآوازِ بلند پکارے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، سب اطمینان سے بیٹھے رہو۔ سکون قائم ہو جائیگا ان علاقوں کے مسلمان، دشمنوں کے ساز و سامان سے کہیں زیادہ اس خلفشار و انتشار کی وجہ سے ہلاک ہوئے ہیں۔ اگر مختلف مقامات پر انھیں پکارنے والے موجود ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ یہ بیچارے اس طرح تباہ ہو جاتے قوم پر یہ قیامت گذر رہی تھی اور راہنمایانِ قوم اور اکابرینِ ملت اپنی اپنی عافیت گاہوں میں محفوظ و مصئون اطمینان سے بیٹھے تھے کہ ہم تو بچ گئے۔ اگر ان میں کہیں حرکت و اضطراب کے آثار نمودار ہوتے تھے تو محض اپنے خویش و اقارب کو بچانے کی خاطر۔ کسی نے بڑا تیر مارا تو بیان شائع کرا دیا۔ اس سے آگے بڑھے تو پناہ گزینوں کے کیمپ کا رسمی معائنہ کر آئے۔ ذرا اس قیامتِ صغریٰ کے نتائج و عواقب کا جائزہ (Census) لے کر دیکھئے کہ عوام کس قدر مارے گئے۔ ان کے خاندان کس قدر تباہ و برباد ہوئے۔ ان کی عزت و ناموس کس درجہ برباد ہوئی۔ اور پھر یہ دیکھئے کہ راہ نمایانِ قوم میں سے کتنوں کے کوئی خراش بھی آئی! کتنوں کے خاندانوں کو ایک وقت کا فاقہ بھی کاٹنا پڑا۔ کتنوں کی آبرو پر ایک حرف بھی آیا! سوچئے کہ یہ سوچنے کی باتیں ہیں۔ اگر ان کے دل میں ذرا بھی قوم کا درد ہوتا تو ان خطرات کی آگ میں خود جل کر راکھ ہو جاتے لیکن عوام پر آنچ نہ آنے دیتے۔ یہ سب کو محفوظ نکال کر پھر آخر میں خود باہر نکلتے۔ یہ پہلے دوسروں کی جان و آبرو کی سلامتی کی فکر کرتے اور پھر اپنوں کی طرف دیکھتے۔ ہاں! یہ ان مرنے والوں کے عین بیچ میں کھڑے ہوتے اور اگر مرنا بھی پڑتا تو ان سب کے ساتھ مرتے۔ پھر دیکھتے کہ اول تو کوئی ان کی قوم کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکتا۔ اور اگر ایسا ہی وقت آجاتا تو وہ موت سب کے لئے کس قدر سکون اور اطمینان کی موت ہوتی اور ان کی قوم کا وقار کس قدر بلند ہو جاتا۔

یہ ہیں وہ چند موٹی موٹی غلطیاں جو ہماری دانست میں، ہم سے، تقسیمِ ہند کے وقت سرزد ہوئیں۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ احتساب و تنقید، بطورِ "شماتتِ ہمسایہ" نہیں بلکہ بغرضِ اصلاح و بہبود ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ سب کچھ دانستہ کیا گیا ہے تاکہ پاکستان کو نقصان پہنچے۔ یہ فیصلوں کی اجتہادی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی ایسی مصلحتیں پس پردہ ہوں جن کے پیشِ نظر اس قسم کے فیصلے ناگزیر ہو گئے ہوں۔ اس صورت میں مناسب یہ تھا کہ ان واقعات کے بعد، یہ مصالح و مقاصدِ پس پردہ، قوم پر واضح کردیئے جاتے تاکہ قوم کے دل سے یہ غلط نقوش محو ہو جاتے کہ یہ سب کچھ اکابرینِ ملت کی ناعاقبت اندیشی اور سوءِ تدبیری سے ہوا ہے۔ نفسیاتی طور پر قوم کا اطمینان، استحکامِ حکومت کے لئے بڑی ضروری چیز ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض راز ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں عوام پر افشا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس قسم کی پردہ داری حالتِ جنگ تک محدود ہوتی ہے۔ جنگ (یا اس قسم کے واقعات کے بعد) یہ راز، راز نہیں رہتے۔ اس وقت ان مصالح کا اخفا قوم کے تحت الشعور میں عدمِ اعتماد کی ایک پھانس بن کر کھٹکتا رہتا ہے اور علمِ نفسیات کے ماہرین جانتے ہیں کہ یہی پھانس بڑے بڑے اہم انقلابات کا موجب بن جاتی ہے۔ غیروں کی حکومت محکوموں کو اپنے مصالح و مقاصد کا رازدار نہیں بناتی۔ اس عدمِ اعتماد کی پھانس کو اپنے استبدادی حربوں سے دباتی رہتی ہے۔ یہی دبائے ہوئے جذبات ایک دن اُس حکومت کے خلاف ابھرتے ہیں۔ اسی کا نام انقلابی روح ہوتا ہے۔ اپنی حکومت ہمیشہ اپنی قوم کا اعتماد حاصل کرتی ہے۔ اور یہی اعتمادِ قوم اس کی بیش بہا متاع ہوتا ہے۔ جن حضرات کی انگلیاں نبضِ ملت پر ہیں وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت ہماری حکومت کو چاہیئے کہ وہ قوم کو اپنا رازدار بنائے اور اس طرح ان کا اعتماد حاصل کر کے اس خلیج کو جلد از جلد پُر کرے جو اُن کے اور قوم کے درمیان حائل ہو رہی ہے۔ اس کا بہترین ذریعہ، قومی پارلیمان میں حزبِ مخالف کا وجود ہوتا ہے جو قوم کے جذبات کی ترجمانی کر کے، قوم کے تحت الشعور میں پھانس پیدا نہیں ہونے دیتا۔ ہمارے ہاں ابھی تک حزبِ مخالف وجود میں نہیں آیا۔ جب تک ایسا نہ ہو اربابِ حکومت کے لئے ضروری ہے کہ دوسرے ذرائع سے قوم کو اپنے مصالح میں شریکِ راز کرے اور اس طرح اُس بُعد و مغائرت کو دور کر دے جو عدمِ اعتماد کا فطری نتیجہ ہے۔ یہاں تک ان غلطیوں کے متعلق حکومت کی

طرف سے صفائی پیش کرنے کے مطالبہ کا تعلق ہے۔ باقی رہے اُن کے نتائج و عواقب، سو جو باتیں ابھی اس قابل ہیں کہ اُن کی اصلاح ہو سکے ان کی اصلاح کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہیں، مثلاً۔

(۱) فاضلہ عملہ کے مسئلہ کا فوری حل۔

(۲) بے روزگاروں کے ذرائع معاش کے لئے ملازمت کے علاوہ دوسری راہوں کا کشاد۔

(۳) حکومت کی مشینری سے غدار منافقین (نیشنلسٹ مسلمانوں) کا استیصال۔

(۴) وہ لوگ جنھوں نے گذشتہ حوادث و نوازل میں، اپنے مقامات اور قوم کو چھوڑ کر اپنی حفاظت کی فکر کی اور قوم کے مصائب میں ان کے ساتھ شریک نہ ہوئے۔ قوم کی امانتوں کو اُن سے چھین کر، قوم کے مخلص ہمدردوں کے سپرد کیا جائے۔

(۵) قومی پارلیمان میں حزب مخالف کی تشکیل۔ اور قوم کے اعتماد عامہ کا حصول۔

(۶) تنقید صحیحہ اور احتساب صالحہ کی جرأت آفرینی اور اس سے سبق آموزی۔

اگر اربابِ حکومت نے ہماری ان مخلص گذارشات کو درخورِ اعتنا سمجھا تو ہمیں امید ہے کہ اس سے قوم کو محسوس ہونے لگ جائے گا کہ اب ہم محکوم نہیں ہیں اور اس طرح پاکستان کے قصرِ مشید کی بنیادیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جائیں گی۔ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابۃ وفرعھا فی السماء۔

دوسری طرف ہم قوم سے بھی یہ درخواست کریں گے کہ وہ اپنی پریشانیوں میں اس حقیقت کو ایک ثانیہ کے لئے بھی نظر انداز نہ ہونے دے کہ مملکتِ پاکستان ان کی اپنی مملکت ہے۔ ان سے کوئی ایسی غلطی سرزد نہیں ہونی چاہیئے جس سے اس مملکت کی فلاح و بقا کو کسی قسم کا نقصان پہنچے کہ یہ نقصان ان کا اپنا نقصان ہوگا۔ کسی غیر کا نقصان نہیں ہوگا۔ مقصد پیش نظر اصلاح و تعمیر ہونا چاہیئے نہ کہ فساد و تخریب۔ وفیھا بصائر للناس۔

بابُ الاسلام سِندھ

گلہ جفائے وفانما، کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدہ میں بیاں کروں، تو کہے صنم بھی ہری ہری

اشاعتِ ماسبق کے لمعات میں صوبائیت کی غیر اسلامی لعنت کا جائزہ لیتے ہوئے ہم نے ضمناً سندھ کے بارے میں ذکر کیا تھا اور "سندھی غیر سندھی" قضیہ نامرضیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قائدِ اعظم کی اس تقریر کا حوالہ دیا تھا جس میں انھوں نے "سندھی، پنجابی، پٹھان اور دہلوی کے تنگ دائروں کو "مسلمانوں کے لئے باعثِ لعنت" بتایا تھا، اور ہم نے یہ خواہش کی تھی کہ

> خدا کرے وہ دن آجائیں کہ ہمارے سندھی بھائی باہر سے آنے والے غیر سندھی مسلمانوں کو اپنے دل کا ٹکڑا سمجھیں اور غیر سندھی مسلمان یہاں کے مسلمانوں کو اپنا بھائی تصور کریں اور ان دونوں کی مواخات و محبت سے پھر سے شرمندگانِ ساحل کے اچھل کر بیکراں ہو جانے کا نظارہ وجہ شادابیٔ قلب و نگاہ ہو جائے جسے دیکھنے کے لئے ہر دیدۂ حساس مضطرب و بے تاب ہے۔

ان الفاظ کی روشنائی ابھی خشک نہیں ہونے پائی تھی اور ہماری معصوم تمنا تجسیمی شکل کے لئے بے تاب تھی کہ سندھ مقننہ کی نشست (۱۱ر فروری) میں صوبہ بھر کے جمہوری نمائندوں اور ان نمائندوں کی نمائندہ حکومت نے یاس و تاسف کا وہ فرمان بھیج دیا۔ ایوان کے سامنے سر محمد اعظم کی یہ تجویز تھی کہ کراچی کو سندھ سے علیحدہ کر کے مرکزی تحویل میں دیدیا جائے۔ کراچی قبل ازیں ایک صوبائی شہر تھا لیکن بین الاقوامی رسل و رسائل کے بحری اور ہوائی مستقر ہونے کی وجہ سے

اس کی حیثیت بتدریج بین الاقوامی بنتی گئی۔ اب پاکستان کے دارالحکومت بن جانے سے اس کی صوبائی حیثیت اور کم ہوگئی ہے۔ بہرکیف سوال یہ تھا کہ یہ شہر انتظامی طور پر مرکز کے سپرد ہو یا بدستور صوبہ کے تحت رہے۔ ہر مسئلہ کے موافق و مخالف پہلو ہوتے ہیں۔ کراچی کی علیحدگی کے حق میں اور اس کے خلاف متعدد دلائل دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن سوچنے کی پہلی چیز یہ ہے کہ یہ سوال پیدا کیوں ہوا؟ کیا پاکستان حکومت نے اپنا مرکز اس لئے یہاں قائم کیا تھا کہ اس کی للچائی ہوئی نظریں کراچی پر تھیں اور وہ اس بہانہ سے سندھ کو اس شہر سے محروم کر دینا چاہتی تھی؟ یا یہ سوال ہر اس شہر کی بابت پیدا ہوتا جہاں حکومت پاکستان اپنا مرکز قائم کرتی؟ پہلا جزو بداہتاً خارج از بحث ہے، اگر مسئلہ کی نوعیت محض جزو ثانی ہے تو معاملہ صاف اور سیدھا ہے، مرکز کو اپنی ضروریات کے مطابق ایک شہر کو اپنی تحویل میں لینا ہے مرکز کی ضروریات بہرنوع صوبائی ضروریات پر مقدم ہیں۔ اگر پاکستان نہ ہوتا تو صوبہ سندھ کی نام نہاد خودمختاری کالعدم ہوتی اور ایک شہر کیا سارے کا سارا صوبہ ہندوستان کا ایک بے حقیقت حصہ ہوتا۔ لیکن سندھی نمائندے اظہار تشکر و امتنان کی بجائے اظہار احسان کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستان نے سندھ کو محفوظ نہیں کیا بلکہ سندھ نے پاکستان کو پناہ دی ہے

زگل فروش سنالم گراں بازار است تپاک گرمی رفتار باغبانم سوخت

ہم اس وقت کراچی کی حیثیت کو زیر بحث نہیں لانا چاہتے کہ وہ ایک مستقل اور علیحدہ بحث ہے۔ اس وقت ہم اس افسوسناک صوبائیت کا ماتم کر رہے ہیں جس کا عریاں مظاہرہ سندھ مقننہ میں ہوا۔ کراچی سندھ کا اہم ترین شہر ہے اور صوبہ کو حق حاصل ہے کہ وہ آئینی طور پر اپنا استحقاق مرکزی حکومت پر واضح کرے۔ بدلے ہوئے حالات میں کراچی کا نظم و نسق کوئی ایسی مشکل نہیں کہ باہمی گفت و شنید اور افہام و تفہیم سے حل نہ ہو سکے۔ یہ مسئلہ اسی طرح حل ہونے کا ہے۔ اس کے لئے نہ کسی "عوامی" تحریک کی ضرورت ہے جو فضا کو خواہ مخواہ مکدر کرے اور نہ غیر معمولی شور و غل کی کہ جس سے نیتوں پر بھی شبہ ہونے لگے۔

اب اخبارات میں اعلان ہوا ہے کہ مرکز نے اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔ جب سندھ مقننہ کا اجلاس ہو رہا تھا اس وقت اس قسم کا اعلان پیش نظر نہیں تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ صوبائی حکومت کو غالباً سرکاری طور پر اس کا علم تھا کہ مرکز ایسی تجویز پر غور کر رہا ہے بنا بریں یہ تمام شور و شین اس لئے کیا گیا کہ مرکز مرعوب ہو کر کراچی کو علیٰحدہ رہنے دے۔ جمہوریت کی اس سے بڑھ کر توہین کیا ہو سکتی ہے کہ اس ہڑبونگ کا اکھاڑہ مقننہ کو بنایا گیا۔

ہم نے سابقہ اشاعت میں لکھا تھا کہ صوبے انتظامی ضروریات کے تحت معرض وجود میں آئے اور وہ ضروریات کلیۃً انگریز کی مخصوص ضروریات تھیں۔ پاکستان کی ضروریات لامحالہ ان سے مختلف ہونگی۔ یوں بھی حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ ایسی ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ بہر حیث صوبائی حد بندی ایک انتظامی ضرورت ہے۔ اس سے ایک مخصوص علاقہ کا نظم و نسق اس حصہ ملک کے سپرد کر دیا جاتا ہے لیکن اس سے اس حصۂ ملک کو یہ اختیار حاصل نہیں ہو جاتا کہ وہ عام ملکی ضروریات کو جن کا نمائندہ مرکز ہوتا ہے نظر انداز کر دے۔ اس کا علاقائی نظم و نسق محدود ہوتا ہے۔ منظم اور مرکزی حکومت کی یہ محذوف شرط ہے جسے حکومت سندھ ازرہ خود غرضی فراموش کر رہی ہے۔

مقننہ میں تجویز پیش کرتے ہوئے اعظم صاحب نے کراچی کی موہوم علیحدگی کو قرارداد لاہور (سنہ ۱۹۴۰ء) کے منافی قرار دیا کہ اس سے حکومت کی ترکیبی اجزا کی خود مختاری پر زد پڑتی ہے۔ اس قسم کی وکیلانہ موشگافیوں میں عموماً ایک سے زیادہ رائیں ہوتی ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ اگر اعظم صاحب کے نزدیک یہ دلیل ایسی ہی محکم تھی تو انہوں نے لگے ہاتھوں وہ نقطہ کیوں نہ بیان کیا جس پر سب متفق ہوں۔ یعنی یہ کہ قرارداد سنہ ۱۹۴۰ء میں کہیں ذکر نہیں کہ پاکستان کا مرکز کراچی ہوگا۔ اگر بغرض استدلال تسلیم کر لیا جائے کہ یہ مجوزہ اقدام قرارداد لاہور کے خلاف ہے تو کیا ایک صحیح قدم محض اس لئے نہیں اٹھایا جائے گا کہ کئی سال پیشتر ہم نے اس وقت کے تقاضوں کے مطابق جو ایک نظریہ قائم کیا تھا اس پر اس سے زد پڑتی ہے؟ سنہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد صحیفہ آسمانی نہیں کہ

آج ہم اس کو ضرورت پڑنے پر بدل نہ سکیں۔ یہ وہی غلامانہ ذہنیت ہے جو جامد تقلید کی پیدا کی ہوئی ہے اور جو انسان کو زندہ اور فعال کارکن کے مقامِ بلند سے گرا کر زندگی کے اس درکِ اسفل تک دے جاتی ہے جہاں قرآن کے الفاظ میں "الناس والحجارۃ" (انسان اور پتھروں) میں، کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا اور دونوں نارِ جہنم کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اسلام انسان کو اسی ظلمت سے نکالنے کا داعی ہے۔ وہ انسان کو ان گرانبار اطواق و سلاسل سے نجات دینا چاہتا ہے جو اس کے ذہنی نارسا اور وہم پرست کوتاہ اندیشی نے اپنے لئے وجہِ مصیبت بنا لئے ہیں۔ چودہ صدیاں سحاب قرآنی کی بارانِ رحمت سے سیراب رہنے کے باوجود آج ہمارا ذہن اسی بوجھ سے دبا ہوا ہے جسے قرآن نے ایک ہی جھٹکے میں زمین پر دے مارا تھا۔ ہم آج بھی اسی وادیٔ جہل و ظلمت میں سرگرداں ہیں جس کے ایک ایک گوشہ پر آفتابِ اسلام چمکا رہا ہے مگر وائے ناکہ ہم اسی بوجھ کے نیچے دب جانا چاہتے ہیں جس نے کمرِ زندگی توڑ کر رکھ دی۔ ہم اسی ظلمت و جہالت کی وادی میں ٹامک ٹوئیے مارتے رہنا چاہتے ہیں جو کامل اندھوں اور خاموشیٔ ازلی کی وادی ہے اور اس نور سے بھاگتے ہیں جو زندگی کی راہیں روشن کرتا ہے۔ کراچی کا شہر ایک طرف، اگر ملکی و ملّی مفاد متقاضی ہو تو سارے صوبہ کا نظام معطل کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسی نوبت آ جائے تو ایک سندھ کیا ہزار سندھ کو مفادِ ملت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑے گا۔ ملت کا مفاد ہر علاقہ (انتظامی ہو یا جغرافیائی) پر مقدم ہے۔ موخرالذکر ملت کے تابع ہیں۔ واضح رہے کہ ہم اس دلیل کو پیش کر کے ہرگز یہ ثابت نہیں کر رہے کہ کراچی کو سندھ سے جدا کر لیا جائے۔ ہم محض یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ذمہ دار حضرات کو اپنا نقطۂ نگاہ معتدل انداز سے پیش کرنا چاہئے اور اظہارِ بیان میں معقولیت کی حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔ یہ روش ان کی دلیل کو محکم نہیں بنائے گی اور عمومی فضا کو ناحق مکدر بنا دے گی۔

اعظم صاحب کے بعد الحاج محمد ہاشم گزدر صاحب کی باری آتی ہے۔ آپ کے خیال میں حکومتِ پاکستان اس قسم کا ارادہ نہیں رکھتی بلکہ چند افراد ایسا چاہتے ہیں اگر یہ درست ہے کہ بعض چند افراد ایسا چاہتے ہیں اور حکومت اس قسم کا ارادہ نہیں رکھتی تو اس ہیجان خیز غوغا آرائی سے فائدہ؟ کیا یہ رقص کسی پسِ پردہ ہلنے والی ......

انگلیوں کا رہن منت ہے ؟ آپ نے اہالیانِ صوبہ سندھ کے احسانات گنواتے ہوئے فرمایا کہ ان کے علاوہ

صوبائی سندھ مسلم لیگ، ان کی نمائندہ حکومت اور وزیراعظم نے قیامِ پاکستان کے لئے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان حکومت جسم سندھ سے سر (کراچی) کو جُدا کر دے۔

پہلے صاحب نے قرارداد ۱۹۴۰ء کی آڑ لے کر جو کچھ فرمایا تھا وہی دوسرے صاحب اپنی خدمات کا تذکرہ کر کے دہرا رہے ہیں۔ کیا آپ کی قربانیاں اس غرض سے تھیں کہ مرکزی حکومت آپ کی زرخرید غلام ہوگی ؟ کیا آپ کو اس وقت معلوم نہ تھا کہ پاکستان کا مرکز بھی ہوگا اور مرکز صوبوں پر فائق ہوتا ہے ؟ آپ اور آپ کے رفقاء کی قربانیاں درست اور بجا سہی۔ لیکن یہ تو سوچئے کہ اگر آپ کی مزعومہ قربانیوں کے عوض میں کراچی آپ کو دیا جا سکتا ہے تو مسلمانانِ ہندوستان کی غیر معمولی جانی و مالی قربانیوں پر کئی کراچیاں نثار کی جا سکتی ہیں۔

وہ چند افراد جو کراچی کو علیحدہ کرنا چاہتے ہیں گذدر صاحب کے نزدیک "پنجابی" ہیں جو قائداعظم کو آلہ کار بنانا چاہتے ہیں۔ گذدر صاحب کو قائداعظم کی ذاتِ گرامی پر اتنا بھی اعتماد نہیں کہ وہ کوئی منصفانہ فیصلہ کر سکیں گے بلکہ انہیں خدشہ ہے کہ وہ پنجابیوں سے مرعوب ہو کر صوبہ سندھ کو "قتل" کر دیں گے۔ ایک اور صاحب قاضی محمد مجتبیٰ نے خود قائداعظم سے اس امید کا اظہار کیا کہ چونکہ وہ خود سندھی ہیں اس لئے وہ سندھ کی طرفداری کریں گے۔ گویا قائداعظم کا فیصلہ مقتضیاتِ وقت کے مطابق اور ملت کے مفادِ اعلیٰ کے پیشِ نظر نہیں ہوگا بلکہ سندھی ہونے کی حیثیت سے وہ حق و انصاف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سندھ کے حق میں فیصلہ دیں گے۔ ابھی پنجابیوں پر یہی اعتراض ہو رہا تھا کہ وہ قائداعظم کو بطور آلہ کار استعمال کر رہے ہیں اور ابھی قاضی صاحب نے ثابت کر دیا کہ "ایں گناہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند" ۔ خیر، گذدر صاحب کے خیال میں محض پنجابی افسر ہی ملزم و مجرم نہیں بلکہ آپ کے خیال میں ان کی بیگمات بھی اس

سازش میں شریک ہیں، شریک ہی نہیں بلکہ وہی اس کی ذمہ دار ہیں۔ اس کی علت گزدر صاحب ایسے مجسمۂ دانش و فراست کے نزدیک یہ ہے کہ وہ سندھی حکام کی شاہانہ قیام گاہوں کو حسد کی نگاہوں سے دیکھتی ہیں اور سندھیوں کو نکال کر ان کی قیام گاہوں پر قبضہ کرلینا چاہتی ہیں۔ صوبہ سندھ کے ذمہ دار جمہوری نمائندہ کے یہ الفاظ جس مخلصانہ طرزِ استدلال کے حامل ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ہم ان سے پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر آپ پر "پنجابیوں" کی طرف سے یہ الزام عائد کیا جائے کہ آپ کراچی کو ہاتھ سے اس لئے نہیں چھوڑنا چاہتے کہ آپ کی بیگمات ملک و قوم کی خاطر شاہانہ قیام گاہوں سے نکلنے کی قربانی نہیں کرسکتیں تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

گزدر صاحب کے بعد محمد ہارون صاحب تشریف لاتے ہیں۔ آپ اس حصۂ شہر کے نمائندے ہیں جسے لیاری کوارٹر کہا جاتا ہے۔ اس حصہ کی پسماندگی کو بھی آپ نے علیحدگی کراچی کے خلاف بطور دلیل استعمال کیا ہے۔ آپ کے کہنے کے مطابق حکومت سندھ نے ان سے اصلاح و ترفیع کے وعدے کر رکھے تھے (ہرچند وہ ایفا نہیں ہوئے) لیکن اگر کراچی پر بیرونی لوگوں کا قبضہ ہوگیا تو ان کی حالت اور خراب ہو جائے گی۔ لہذا وہ عزم مصمم کئے ہوئے ہیں کہ

شہر کراچی کو پاکستان کی تحویل میں نہیں جانے دیں گے۔

یہ کراچی کو پاکستان کی تحویل میں نہ دینے کی بھی ایک ہی رہی۔ سارا صوبہ سندھ پاکستان کی تحویل میں ہے۔ مرکز کے ماتحت اس کے صوبائی اختیارات مرکز کے عطا کردہ ہیں۔ صوبہ میں کراچی شامل ہے لہذا کراچی پاکستان کی تحویل میں ہے۔ ہارون صاحب کس تبدیلی کا ذکر کر رہے ہیں؟ اگر ان کی مراد اس سے یہ ہے کہ کراچی کا انتظام براہِ راست مرکز کی تحویل میں نہ ہو اور بدستور صوبہ کی تحویل میں رہے تو وہ پاکستان کا طنزاً ذکر کیوں کرتے ہیں؟ سادہ اور صاف الفاظ میں کیوں نہیں کہہ دیتے کہ انھیں [illegible] پر اعتراض ہے اور بس۔ پھر

آپ نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ پاکستان کی تحویل میں چلے جانے کے بعد کراچی کے لیاری کوارٹرز کی حالت بدتر ہو جائے گی، کیا پاکستان کا ایک صوبہ بن جانے پر سندھ کی حالت بدتر ہو گئی ہے؟ اس امر کا کیا ثبوت ہے کہ سندھ حکومت جو اصلاحات نافذ نہیں کر سکی وہ مرکزی حکومت بھی نہیں کر سکے گی؟ اگر بغرض الزامی دلیل یہ کہا جائے کہ مرکز کے ماتحت ہو جانے پر لیاری کوارٹر انسانوں کی بستی نظر آنے لگے گی تو ہارون صاحب کیسے اس کی تردید کر سکیں گے؟

ایک ہندو نمائندہ مسٹر بھوارام کیشوانی نے تو بات ہی ختم کر دی اور سرے سے مرکزی حکومت کا یہ حق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ کراچی کو سندھ سے علیحدہ کر سکتی ہے۔ مسلمانوں کی بھری محفل میں ایک غیر نمائندہ کے یہ الفاظ یقیناً موجب حیرت ہوتے اگر خود مسلمانوں نے ایسی فضا نہ پیدا کر رکھی ہوتی جس میں حدود کا پاس ختم ہو جاتا ہے۔ دراصل مسٹر کیشوانی مسلمانوں کے تتبع میں ایسا نہیں کہہ رہے بلکہ وہ اس قوم کے فرد ہیں جو اس مسموم صوبائیت کی پروردگاہ ہے شاطر اور عیار ہندو نے غیر سندھی کا سوال اسی لئے کھڑا کیا تھا کہ وہ بیرون سندھ کے مسلمانوں کی آمد میں اپنی اقتصادی (لہٰذا سیاسی) انحصار (Monopoly) اور لوٹ کھسوٹ کا خاتمہ دیکھ رہا تھا، چنانچہ اس نے ایسی فضا پیدا کی جس سے غیر سندھی اور مسلمان، خصوصیت سے پنجاب سے آئے ہوئے مسلمان مرادف سمجھے جائیں گے۔ کراچی (لہٰذا سندھ) کی تجارت بیشتر ہندوؤں کے قبضہ میں تھی۔ ان ہندوؤں میں معتدبہ غیر سندھی ہندو تھے، لیکن کیا سندھ کے مسلمان نمائندوں نے کبھی اس کے خلاف بھی احتجاج کیا؟ اب اگر مسلمان سندھ میں آ رہے ہیں تو اس لئے نہیں کہ سندھ جنت ارضی ہے بلکہ اس لئے کہ یہ مرکز حکومت ہے۔ مرکز حکومت ہمیشہ اسی کشش کا مالک ہوتا ہے، اور عوام و خواص لامحالہ ادھر کھنچکر آ جاتے ہیں۔ یہی مرکز بیرون سندھ قائم ہوتا تو ان عوامل سے خود سندھی مجبور ہو جاتے کہ ادھر نقل مکانی کر لیں۔ اس کے علاوہ سندھ میں آنیوالے وہ لوگ ہیں جو ہندوستان میں اپنا سب کچھ لٹا کر آئے ہیں۔ وہ یہاں آ کر سندھ سے خیرات

نہیں طلب کرتے بلکہ اپنی محنت اور عرق ریزی سے اس صوبہ کی دولت اور پیداوار میں بیش بہا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے بوئے ہوئے بیج کا پھل سندھ کو بھی ملے گا۔ انہیں پناہ دے کر سندھ ان پر احسان و کرم نہیں کر رہا، بلکہ اپنی ترقی و خوشحالی کی راہیں کھول رہا ہے۔ ذرا اعداد و شمار اکٹھے کیجئے اور دیکھئے کہ کراچی کی تعمیر و دولت میں سندھی مسلمانوں کا کتنا حصہ ہے، حکومتِ سندھ ان اعداد و شمار کو ہم سے بہتر جانتی ہے۔ ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ کراچی ہی نہیں بلکہ سندھ بھر میں غیر سندھی مسلمان کو جو کچھ مل رہا ہے وہ سندھی مسلمانوں کے حصہ سے چھینا نہیں جا رہا بلکہ وہ تارکینِ وطن ہندوؤں کا حصہ حاصل کر رہے ہیں اور وہ بھی غاصبانہ نہیں بلکہ عین حق و انصاف کے مطابق حالانکہ اگر وہ اس حصہ پر غاصبانہ قبضہ بھی کرنا چاہتے تو ہندوؤں کے طرزِ عمل کے مطابق یہ بھی ناروا نہ تھا۔ اس لئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے املاک و اموال کے مالک یہی ہندو ہندوستان پہنچکر بننے والے ہیں۔

آخر میں وزیرِ اعظم نے اس گفتگو کو ختم کرتے ہوئے کہا کہ مزید بحث عبث ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ وزیرِ اعظم کو یہ احساس ہو گیا کہ بحث ضرورت و افادیت کی حد سے تجاوز کر گئی ہے۔ ہمارے اور ہر بہی خواہ ملت کے نزدیک یہ ساری بحث سرے سے عبث تھی۔ بحث کے ایام میں یا تو کراچی کی علیحدگی کا مسئلہ مرکزی حکومت کے زیرِ غور تھا یا نہیں تھا۔ اگر نہیں تھا تو بات ختم تھی۔ اگر تھا تو حکومتِ سندھ کے لئے انسب طریقِ کار یہ تھا کہ وہ اپنے اعتراضات باقاعدہ طور پر اور رسمی طریقہ سے مرکزی حکومت کے سامنے پیش کرتی اور اپنا نقطہ نگاہ پوری طرح واضح کرتی ہمیں ان کے جذبات سے ہمدردی ہے۔ ہم خواہ مخواہ کراچی کو سندھ سے کاٹ دینے کے متمنی نہیں۔ البتہ اس اقدام کو جملہ دیگر اقدامات کی طرح مفادِ ملت کے تابع رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ملت کا مفاد اس میں ہے تو یہ اقدام فوراً ہو جانا چاہئے۔ اس میں حکومتِ سندھ کے لئے چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ اور اگر یہ مفادِ ملت کے لئے موزوں نہیں تو ہمیں امید نہیں کہ حکومتِ ہند خواہ مخواہ اس قسم کا اقدام کریگی۔

ہمیں افسوس ہے کہ سندھی مقننہ نے ایسی روش کا مظاہرہ کیا جس سے ہم اس تلخ نوائی پر مجبور ہو گئے۔ وہ یقین مانیں کہ اس احتساب سے ہم مرکز یا پنجاب یا اہل پنجاب کی طرفداری نہیں کر رہے ہیں جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ پنجابی اور سندھی کی تمیز ہمارے نزدیک زمانہ قبل از اسلام کی جاہلیت کی یادگار رہے اس لئے ہم اس تفریق کی تائید کیوں کرنے لگے ہیں۔ اس احتساب سے اس غلط اصل کی مخالفت ہے جو شجر اسلام کی جڑوں کو کاٹ رہا ہے اور وہ اصل بہر حیث مردود و ملعون ہے خواہ اس کا مظاہرہ سندھی سے ہو یا پنجابی سے۔ صوبہ سے ہو یا مرکز سے۔

ہم اس احتساب کا خاتمہ اس دعا پر کرتے ہیں جس سے یہ تحریر شروع کی گئی ہے اور جو اقتباس ہے سابقہ اشاعت کے لمحات کا۔

> خدا کرے جلد وہ دن آجائیں کہ ہمارے سندھی بھائی باہر سے آنے والے غیر سندھی مسلمانوں کو اپنے دل کا ٹکڑہ سمجھیں اور غیر سندھی مسلمان یہاں کے مسلمانوں کو اپنا بھائی تصور کریں اور ان دونوں کی مواخات و محبت سے پھر سے ان شرمندگان ساحل کے اچھل کر بیکراں ہو جانے کا نظارہ وجہ شادابی قلب و نگاہ ہو جائے۔ جسے دیکھنے کے لئے ہر دیدہ حساس مضطرب و حساس ہے۔

یا رب ایں دعائے من چہ خوش است

اب آپ حکومت سندھ کی مجلس مقننہ کے ایوان سے باہر نکل کر ذرا اس سلوک کو دیکھئے جو یہاں باہر سے آئے ہوئے مفلوک الحال مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے۔ یہ غریب الدیار مظلوم و ستم رسیدہ، خانماں خراب، متاع بردہ، ماتم گساران ملت جس کس مپرسی کی حالت میں یہاں پہنچے ہیں وہ کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔ پشت ہا پشت کی محنت شاقہ سے جو اثاثہ جمع ہوا تھا وہ دنوں میں غارت ہو گیا اور بیچارے بمشکل جان و ناموس بچا کر گرتے مرتے یہاں تک پہنچے ہیں۔ یہاں آ کر ان کے لئے مسکن نہیں، پناہ گاہ نہیں، وسیلہ معاش نہیں،

الغرض زندگی کی تمام راہیں ان پر مسدود ہیں، ان کے لئے صرف ایک راستہ کھلا تھا اور وہ گداگری تھا، لیکن ان جفاکش اور غیور مسلمانوں نے اس ذلت کو گوارا نہیں کیا اور انھوں نے حلال وطیب کمائی کو ترجیح دی۔ کراچی میں دوکانوں کی تقسیم وتخصیص میں جو اندھیر نگری مچی ہوئی ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ ان بے چاروں کے پاس پیسے کہاں کہ رشوت دیکر دکانیں اپنے نام مخصوص کرا سکیں یا غیر معمولی قیمتیں دیکر جو بر بازار ستے سامان خرید کر اس سے کہیں زیادہ داموں پر بیچ سکیں چنانچہ یہ بچارے، پٹڑیوں اور خالی غیر آباد جگہوں پر آسمان کے نیچے بیٹھ گئے اور کسبِ معاش کی صورتیں پیدا کرنی شروع کیں یوں ان ماندگانِ قوم سے جو بن پڑا کیا اور اپنے اور بقیۃ السیف بیوی بچوں کا پیٹ پالنا شروع کیا۔ حکومت نے ان غریب الدیاروں اور بے یاروں کو کوئی مراعات نہیں دیں، نہ انھیں دوکانوں کے لئے کوئی جگہ دی، نہ رہنے کے لئے مکان اور نہ کاروبار شروع کرنے کے لئے ضروری سرمایہ بہم پہنچایا۔ لیکن جب ان لوگوں نے شبانہ روز محنت وجانفشانی سے راہگذر پر بیٹھ بیٹھ کر کسبِ معاش کی حقیر صورتیں پیدا کیں، تو حکومت کا قانون فوراً حرکت میں آیا اور ان پر یہ ذریعہ معاش بند کردیا۔ چنانچہ ان بدنصیبوں کو پٹڑیوں پر سے اٹھا دیا گیا ہے۔ غالب کے زمانہ میں اتنا تو اطمینان تھا کہ رہگذر پر بیٹھنے والوں کو کوئی نہیں اٹھا سکتا تھا لیکن بیسویں صدی میں یہ اطمینان مفقود ہے۔ اب ہماری رہگذر حکومت کی دسترس سے کچھ بھی محفوظ نہیں۔ موت کے منہ سے جان جوکھوں میں ڈالکر جان بچا کر پاکستان میں پناہ ڈھونڈنے والے نیم مردہ، پاکستان میں بھی موت ہی کے منہ میں دھکیلے جارہے ہیں؟ کیا اس سے یہ بہتر نہ تھا کہ وہ دشمنوں کی سفاکیوں کی نذر ہو جاتے! کم از کم وہ اس تلخی اور مایوسی کا شکار تو نہ ہوتے کہ جس پاکستان کے قیام کی خاطر انھوں نے اپنا سب کچھ قربان کردیا تھا وہی ان کی رسوا کن موت کا باعث ہوا، وہ جسے جنت سمجھ رہے تھے وہ جہنم ثابت ہوا، وہ پھول چننے کے لئے بڑھے تو ان کی انگلیوں میں کانٹے پیوست ہوئے، وہ اپنے بنائے ہوئے پاکستان کے قلب میں اترے اور انھیں ٹھکرا دیا گیا، وہ روٹی مانگتے

نہیں تھے، انھوں نے خون پسینہ ایک کر کے روٹی کمائی اور حکومت پر بوجھ بننا گوارا نہ کیا، لیکن حکومت نے ان کی کمائی ہوئی روٹی اُن سے چھین لی اور انھیں اور ان کے بھوکے بیوی بچوں کو بے رحم قانون کے رتھ کے نیچے کچل کر رکھدیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ خوبصورت کراچی کی کشادہ سڑکوں کی دیدہ زیب پٹریوں پر یہ عرق ریز انسانی گروہ، بھدے، بدصورت، مفلوک الحال انسان کلنک کا ٹیکہ تھے، وہ امراء و روسائے شہر کے لئے ٹھوکر تھے، دختران تہذیب نو کے لئے ان کا نظارہ بھیانک تھا۔ وہ انسان نہیں تھے بے جان پتھر تھے، ہر چلنے والے کے لئے ٹھوکر۔ ان پتھروں کا راستہ سے ہٹا دینا ہی بہتر تھا۔ اب کشادہ شاہراہیں، کشادہ روشیں پھر سے سیر و تفریح کے لئے کھلی ہیں۔ کلی شوق اور پورے اطمینان سے ٹہلئے اور بھول جائیے اس قیامت کو کہ جس کے اثرات سے یہ پریشان روزگار انبوہ در انبوہ مارے مارے پھرتے ہیں اور ان کا کوئی پُرسان حال نہیں۔ یہ نفاست و نزاکت بجا اور درست! لیکن قسم ہے اُس خدائے قدوس کی جس نے رب العالمین اور خیر الرازقین کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا ہے کہ دنیا بھر کی نزاکتیں اور لطافتیں جہنم میں جھونکدینے کے قابل ہیں اگر وہ کسی ایک انسانی بچہ کے مُنہ سے روٹی کا لقمہ چھین کر وجود میں لائی گئی ہوں

مہاجرین کے کثیر تعداد میں آجانے سے کراچی ویسا صاف ستھرا نہیں رہا جیسا پہلے رہا کرتا تھا۔ یہ قدرتی امر تھا۔ تقاضائے شہریت یہی ہے کہ راستے اور بازار صاف ستھرے رہیں مگر حالیہ قیامت نے جو چند در چند معاشرتی مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کا حل شہریت کے سطحی تقاضوں اور کاغذی احوالوں میں نہیں۔ یہ تباہ حال جن کو آج پتھروں کی طرح راستے سے ہٹا دیا گیا ہے، علامت ہیں اس گہرے معاشرتی مرض کی جو ہمارے جسد ملت میں پیدا ہو گیا ہے۔ اس مرض کا استیصال علامتِ مرض کو نگاہوں سے اوجھل کر دینے سے نہیں ہوگا، یہ خود فریبی ہوگی۔ حکومت کو معلوم نہیں کہ اس نے پٹریوں پر بیٹھنے والوں کو اٹھوا کر کتنا ظلم عظیم کیا ہے، اس ایک حکم سے ہزاروں انسان فاقے سے سوئے ہوں گے، یہ ٹھیک ہے کہ حکومت کا

قانون جب ضرورت پڑے حرکت میں آسکتا ہے لیکن حکومت محض قانون کا نام نہیں، اس کا کام قانون پاس کر دینا یا رائج کر دینا ہی نہیں۔ اس کے فرائض بھی ہیں۔ وہ قانون کی آڑ لیکر اپنے فرائض سے سبکدوش نہیں ہو سکتی اس کا فرض تھا کہ وہ مہاجرین کے لئے کوئی جگہ مخصوص کرتی جہاں وہ کاروبار کر سکتے، ان کے لئے مناسب رہائش گاہیں مہیا کرتی تاکہ عام راہوں پر سونیکی بجائے وہ ان مقامات پر شب باشی کر سکتے اور شہر کی صحت کے لئے خطرہ کا موجب نہ بنتے۔ حکومت نے اپنے ان فرائض سے مجرمانہ پہلوتہی کی اور جب مہاجرین از خود راہ ہائے عمل تراشنے میں کامیاب ہو گئے تو ان کے سعی عمل کو قانون کی ایک حرکت سے اکارت کر دیا۔

نظری طور پر گذرگاہوں پر کاروباری ہجوم قابلِ اعتراض ہے۔ مگر حقیقت ہے کہ اس طریقہ سے لاکھوں آدمی جائز وسائلِ معاش میں منہمک ہو کر باعزت شہری بنتے جا رہے تھے، بیکار دماغ شیطان کی کارگہ ہوتے ہیں۔ بیکار مہاجرین اس کلیہ کی استثنا نہیں ہوں گے ان کے لئے ہی نہیں بلکہ معاشرہ کے لئے بھی ان کا کاروبار میں مصروف رہنا مفید و بہتر ہے کسب حلال کی راہیں ان کے لئے کھلی ہونگی تو وہ پوری جانفشانی سے ان سے عہدہ برآ ہونگے لیکن ان کو ایک دفعہ ان راہوں پر چلنے سے روک دیا گیا تو وہ معاشرہ کے لئے مستقل خطرہ کا باعث بن جائیں گے۔ جائز وسیلوں کے مہیا نہ ہونے سے ناجائز وسیلے سامنے آجاتے ہیں۔ پیٹ کا دوزخ تو بھرنا ہی ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو موجودہ جائز ذرائع سے روٹی کمانیکی اجازت نہیں دیجائے گی وہ ناجائز ذرائع سے اس کمی کو پورا کریں گے۔ جن کو شہری نہیں بننے دیا جائے گا وہ اخلاقی مجرم بنیں گے۔ جس قیامت سے مسلمان پچھلے دنوں گذرا ہے۔ اس کے بعد اگر ہمارے معاشرہ کی بنیادیں تک بھی ہل جاتیں تو بھی کچھ مستبعد نہ تھا۔ ایسے زلزلہ انگیز حوادث سے معاشرہ کی جڑیں تک اکھڑ جایا کرتی ہیں۔ لیکن یہ تو اللہ کا احسان ہے کہ یہاں ایسا نہیں ہوا۔ اگر خدانخواستہ وہ ایسی صورت پیدا ہو جاتی تو یہ فتنہ ہماری نوزائیدہ حکومت کے سنبھالے سنبھل نہ سکتا۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ سندھ ان خوابیدہ فتنوں کو جگا کے ہی دم لے گی اور وہ اس مجلسی خلفشار کو برپا کر کے ہی چھوڑے گی جس سے اب تک ہم از راہِ خوش قسمتی محفوظ رہے ہیں۔ اندریں حالات ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ حقائق سے پہلوتہی نہ کرے۔ مہاجرین کے لئے مناسب جگہیں مخصوص کر دی جائیں جہاں یہ بے خوف و خطر اپنا کاروبار چلا سکیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ مطلوبہ دکانات اور مکانات جادو کی لکڑی سے مہیا نہیں ہو جائیں گے اور ان کی فراہمی اور تعمیر بہرحال کافی وقت لے گی۔ حکومت اس ضمن میں مجبور ہے اور ہم اس کی مجبوری کا کماحقہٗ احساس رکھتے ہیں لیکن حکومت یقیناً مجبور نہیں ہے کہ جن مہاجرین نے کاروبار و رہائش کی جو متبادل صورتیں پیدا کر لی ہیں اور جو امن و صحت عامہ کے لئے فوری اور حقیقی خطرہ نہیں ہے ان سے ان کو محروم کر دے۔ حکومت اگر اپنے فریضہ کی ادائیگی سے قاصر رہی ہے اور خود متبادل صورتیں مہیا نہیں کر سکتی تو مہاجرین کی پیدا کردہ صورتوں کو ان سے چھین لینا اس کے لئے کسی طور مستحسن نہیں۔ یہ سلبی اور تخریبی اقدام بغیر کسی تعمیری پہلو کے نقصان رساں ہے۔

ہم اس ضمن میں لاہور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اس حکم کا بھی جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ لاہور میں ۹ فروری سے گداگری ختم کر دی جائے گی۔ ہر چند اس فیصلہ کی تفصیلات ہمارے پیشِ نظر نہیں لیکن یہ اقدام اسی قبیل سے ہے جس پر ہم تبصرہ کرتے چلے آ رہے ہیں، تقسیم ہند یونہی شاید کوئی ایسا اہم واقعہ نہ ہوتا لیکن تقسیم جن حالات میں معرضِ عمل میں آئی ہے اس سے ہمارے سامنے انواع و اقسام کے مسائل آ گئے ہیں جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے مشرقی پنجاب اور دہلی کی قتل گاہوں سے جو مسلمان بچ سکے وہ ناقابلِ بیان مصائب سے دوچار ہو کر پاکستان پہنچے تعجب ہے کہ ان نیم عریاں، نیم مردہ انسانوں کا سیلاب نومولود پاکستان کو بہا کر نہیں لے گیا۔ ان میں بیشتر وہ گھرانے اجڑے ہیں کہ جو مسلمانوں کی اس برصغیر میں آمد کے وقت سے آباد چلے آ رہے تھے اور انہیں کوئی انقلاب اکھیڑ کر پھینک نہ سکا۔ وہ اس حال

میں پاکستان آسکے ہیں کہ ان کے بدن پر کپڑے نہیں، کھانے کے لئے روٹی نہیں، سر چھپانے کو ٹھکانا نہیں، جب ان کے لئے حکومت کی طرف سے ذریعہ معاش کا کوئی مناسب انتظام نہ کیا گیا تو وہ مجبور ہیں کہ پٹڑیوں پر بیٹھکر سودا بیچیں اور جو اتنا مقدور بھی نہ رکھتے ہوں وہ گداگری کریں۔ وہ حق بجانب ہیں کہ بھیک مانگیں۔ پاکستان کے لئے قربان ہونیوالے پاکستان میں بھی قربان ہو رہے ہیں۔ چند پیشہ ور گداگروں کو چھوڑ کر انھیں اس پیشہ سے باز رکھنے کے لئے نفسیات کے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہوگی باقی گداگر یہ لعنت اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ انھیں آج متبادل راہوں پر ڈالا جائے وہ فوری طور پر اس ذلت کی زندگی کو ترک کردیں گے۔

ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ گداگری ایک عمدہ ذریعہ معاش ہے اسے ضرور جاری رہنے دیا جائے، ہم جو کہہ رہے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ گداگروں کو غریب خانوں میں جمع کردینا علامات مرض کو دبا دینے کے مرادف ہے۔ مرض اس کے باوجود باقی رہیگا اور اس کا دفعیہ نہیں ہوجائیگا کراچی کی پٹڑیاں اور لاہور کے غریب خانے ایک ہی مرض کی علامات ہیں اور اس مرض کا ایک ہی علاج ہے۔ یہ گہرا مجلسی اور اقتصادی مرض ہے اور اس کا علاج معاش کی دوسری راہوں کی کشائش ہے۔ یہ مسئلہ صوبائی یا مقامی نہیں بلکہ مرکزی مسئلہ ہے اور اسے کامل تدبر سے مرکزی طور پر یکساں حکمت عملی سے حل کرنا چاہیئے۔ پیشہ ور یا مجبور گداگروں کو غریب خانوں میں مقید کردیا گیا یا جو اپنے والوں کو پٹڑیوں پر سے اٹھا دیا گیا تو قومی اعتبار سے معالجوں کا تو رہیگا بیکار مہاجرین دیگر خطرات مجلسی کا باعث ہونے کے علاوہ اقتصادی بوجھ بن جائیں گے اور مفلس قوم مفلس تر ہوجائے گی۔ اشد ضرورت ہے کہ وسائل معاش کی موجودہ مضمر راہوں کو کھول دیا جائے تاکہ یہ لوگ اپنے میلانات و رجحانات کے مطابق راہیں منتخب کرلیں اور محنت و عمل سے پاکستان کی دولت و اقتصادی فارغ البالی میں بیش از بیش اضافہ کریں۔ اس امر کو بھولنا نہیں چاہیئے کہ یہ مشکل کسی سخت گیر قانون کے نفاذ سے حل نہیں ہوجائے گی بلکہ اس سے اس مشکل میں اور اضافہ ہوگا۔ اس کا صحیح حل یہی ہے کہ یہاں وہاں پیوند لگانے کی کوشش کے بجائے اسے مجلسی اقتصادی

مسئلہ سمجھ کر بحیثیت کل حل کیا جائے۔ مسائل ہمہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے حل کرنے کے نام نہاد طریقے فرار کی راہیں ہیں۔ انسان اور اس کے مسائل ایک "کل" ہیں وہ اجزا میں منقسم نہیں ہو سکتے بحیثیت کل وہ حل کے قابل ہیں اور اجزا میں بٹ کر لاینحل بنجاتے ہیں۔ عہدِ حاضر کے مصائب کا بنیادی سبب یہی ایک ہے اور یہی راہ عمل یہاں اختیار کی جا رہی ہے! اس کے متعلق اس سے زیادہ یہاں اور کیا کہا جائے کہ جہانبانی کے لئے جہاں بینی کی اشد ضرورت ہے اور یہاں یہ عالم ہے کہ

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنھیں

خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے

سندھ اور پنجاب کے بعد اب بنگال کی باری آتی ہے۔ ہم نے سابقہ اشاعت میں مشرقی پاکستان کے مسلمانوں سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ صوبائی تعصب کے تنگنائے سے نکل کر ملت اسلامیہ کے یم بیکراں کی وسعتوں سے ہمکنار ہو جائیں۔ لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہاں بھی اس قسم کے خیالات اُفق اذہان سے اُبھر رہے ہیں جو صوبائی حدود کو آہنی دیواریں بنانے کی تاکید کر رہے ہیں۔ پاکستان کی وحدت کے پیش نظر زبان کی وحدت کا سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس باب میں ایک بنگالی مسلمان کا خط جریدۂ اسٹیٹس مین کی ۔ رفروری کی اشاعت میں شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔

پاکستان کی بعض بلند پایہ ہستیاں، اُردو کو سرکاری زبان قرار دینے کی فکر میں ہیں ہم بنگالی مسلمان اس کے خلاف ہیں...... اُردو ہندوستان کی سرکاری زبان تو ہو سکتی ہے لیکن پاکستان کی نہیں۔ پاکستان کی سرکاری زبان بنگالی ہونی چاہیئے۔

یہاں تک تو خیر ایک تجویز کی صورت ہے۔ آگے چلکر لکھا ہے

پاکستان کو وجود میں آئے ابھی چند ماہ بھی نہیں ہوئے کہ غیر بنگالی مسلمان بنگالی

مسلمانوں پر چھائے جا رہے ہیں، اگر اُردو کو سرکاری زبان قرار دیدیا گیا تو یہ بنگالی مسلمانوں کی ترقی کے لئے پیغامِ موت ہوگا۔

یہ ہیں "بنگالی مسلمان اور غیر بنگالی مسلمان" کی تفریق کے جراثیم جو شجرِ پاکستان کی جڑوں تک کو کھوکھلا کر دیں گے۔ انہیں کس طرح سے سمجھایا جائے کہ مسلمان فقط مسلمان ہوا کرتا ہے، بنگالی اور غیر بنگالی نہیں ہوا کرتا۔ یہ دشمنی تفریق یکسر غیر اسلامی فکر کی تخلیق ہے۔ خدا کے لئے عہدِ جاہلیت کے ان آثار و نقوش کو دامنِ نگاہ سے دھو ڈالئے اور استحکامِ پاکستان کی خاطر جو تجویز یا تنقید آپ کو کرنی ہو اُسے خالص مسلمان کے نقطۂ نگاہ سے پیش کیجئے۔

اے پاکستان کے مسلمان، تیری فلاح اور بقا کا راز اس میں ہے کہ

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ افغانی نہ ایرانی

ھدیۂ تہنیت

کاپیاں پریس میں جا چکی تھیں کہ ۲۸ فروری کی شام کو حکومت پاکستان کے وزیر مالیات، محترم غلام محمد صاحب نے اپنی بجٹ کی تقریر میں اعلان فرمایا کہ انہوں نے اقبال اکیڈیمی کے قیام کیلئے ایک لاکھ روپے کی گرانٹ بجٹ میں شامل کی ہے۔

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

مقامِ ہزار شکر گذاری ہے کہ پاکستان کے اربابِ حکومت میں سے کسی کو تو خیال آیا کہ اقبالؒ بھی اس قابل ہے کہ اس کی یاد قائم رکھی جائے۔ ہم محترم غلام محمد صاحب کی خدمت میں اس ہدیۂ احسان شناسی کے لئے دلی ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔ ع دیدہ ام مرنے دریں قحط الرجال

اقبال اکیڈیمی کن خطوط پر متشکل ہونی چاہیئے۔ اس کے متعلق آئندہ اشاعت میں گفتگو کیجائیگی۔ وبیدہ التوفیق

پاکستان مجلسِ دستور ساز کے ارکان سے

طلوعِ اسلام کے شمارہ گذشتہ میں ہم عنوانِ بالا کے تحت پاکستان کے اُن ممتاز حضرات سے اجمالاً خطاب کر چکے ہیں جنھیں اس نوزائیدہ مملکت کے دستورِ اساسی کی تشکیل کے لئے پاکستان مجلسِ دستور ساز (Constituent Asse کا رکن منتخب کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، ان پر یہ اہم فریضہ اور عظیم القدر ذمہ داری ہے۔ ہم نے پاکستان کی جنگ اس اصول پر لڑی کہ بہ لحاظ مذہب اسلامیانِ ہند ایک الگ اور مستقل قوم ہیں اور ان کا قومی مزاج اس امر کا متقاضی ہے کہ ان کا الگ قومی وطن (ہوم لینڈ) ہو، جہاں وہ اپنے ملی تقاضے آزادانہ پورے کر سکیں۔ چند عوامل نے تحریکِ پاکستان کی رفتار کو تیز ضرور کر دیا لیکن اس تحریک کی بنیاد اسی اثباتی (positive) اصول پر تھی جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔ الگ امتیازی قومی تشخص کے احساس کے بعد یہ ناممکن تھا کہ مسلمان اپنے قومی گھر کے حصول کے لئے سرگرمِ عمل نہ ہوتے۔ دس سالہ جنگِ پاکستان کے دوران میں ہم نے بارہا اپنے اس عقیدہ کا اعلان کیا کہ ہم مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور ہمیں ایک ایسا قطعۂ ارض چاہیئے جہاں ہم قرآن کے مطابق اپنے معاشرے کو ڈھال سکیں۔ علمائے کرام اور پیرانِ عظام نے اسی عقیدہ کی بنا پر تحریکِ پاکستان کو کفر و اسلام کی جنگ کہا جس میں ایک طرف وہ طاغوتی طاقتیں صف آرا ہیں جو اسلام کی سربلندی کو اپنے لئے ایک مستقل خطرہ سمجھتی ہیں اور دوسری طرف وہ عساکرِ حق آمادۂ مبارزت ہیں جن کی زندگی کا نصب العین ہی دینِ حق کا قیام ہے۔ لیگ کے ذمہ دار قائدین نے اسی چیز کو اپنی تقریروں اور اپنے بیانوں میں دہرایا کہ لیگ اور غیر لیگ کا مسئلہ دراصل حق و باطل کا معرکہ ہے۔ قوم کے سامنے اسلام، قرآن، خدا، رسول اور قیامت کو پیش کر کے امداد و اعانت طلب کی گئی۔ قوم نے 'حق' کی اس دعوت پر پُرجوش لبیک کہی اور چند

سالوں میں لیگ کو ایک زندہ طاقت بنا دیا۔ لیگ کی یہ حیرت انگیز مقبولیت اور معجز اثر کامیابی لیگ کی جماعتی تنظیم کا نتیجہ یا عمائدینِ لیگ کے ذاتی کردار کا حاصل نہ تھی بلکہ یہ اثر تھا اُس واضح اور غیر مبہم اشوع (Issue) کا جو 'حق و باطل' 'اسلام و کفر' 'دینی و لادینی' 'خدا و طاغوت' کی صورت میں قوم کے سامنے پیش کیا گیا۔ مجالسِ مقننہ کے انتخابات، مسئلہ زبان، تعلیم، قومی ترانہ، قومی جھنڈا، ذبیحۂ گاؤ، آئینی حقوق کی جنگ، غرض سیاسی کشمکش کے ہر مرحلے پر جب کفر و اسلام کا سوال پیدا کیا گیا تو مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ لیگ کی تحریک فی الواقعہ ایک اسلامی تحریک ہے جو پاکستان کی صورت میں ایک ایسی فضا پیدا کرنا چاہتی ہے جہاں کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں بلکہ وہ ابدی قانون جاری و ساری ہو گا جس کی تشکیل انسانی ہاتھوں کی محتاج نہیں ہوئی اور انسانی دستور جس میں ایک شمہ برابر بھی تبدیلی نہیں کر سکی۔

پاکستان آج ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ملتِ پاکستان اپنی خوش بختی پر کیوں نازاں نہ کرے کہ اُسے وہ عظیم المرتبت انعام، خلافتِ ارضی، عطا کیا گیا ہے جو کسی قوم پر اللہ کا سب سے بڑا احسان ہوا کرتا ہے دو سو سال کی جگر کاویاں اور سینہ سوزیاں بالآخر ختم ہوئیں اور اس قطعۂ ارض کے مسلمان پھر سے اپنے گھر میں اپنی قسمت کے خود مالک بن گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان ہماری توقعات اور ہمارے اندازوں کے مقابلے میں بہت جلد حاصل ہوا ہے۔ پاکستان اگر اس برق رفتاری سے حاصل نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ سست رو اور نرم خرام آئینی تبدیلیوں کے دوران میں اسلامی حکومت اور قرآنی قانون کے متعلق جاذب اور دلخوش کن وعدے مسلمانوں کو بھول جاتے۔ لیکن پاکستان توقعات اور اندازوں سے اتنا پہلے مل گیا ہے کہ وہ وعدے عوام المسلمین کے ذہنوں میں ابھی تک تازہ ہیں اور حصولِ مقصد کے ساتھ فوراً اُبھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ وہ بے تابی سے دریافت کرتے ہیں کہ پاکستان کے نظام کو کب قرآنی رنگ دیا جائیگا؟ اسلام کی حکومت کب قائم ہو گی؟ پاکستان کے اربابِ اقتدار اپنے اُن مواعید کی تکمیل کیوں نہیں کرتے جو اسلامی حکومت کے قیام کے متعلق کئے جاتے رہے ہیں؟ پاکستان کو اسلامی اسٹیٹ کہنے میں کیوں جھجک محسوس کی جا رہی ہے؟ عوام کے اضطراب اور اربابِ اختیار کے سکوت نے فضا میں اس بحث سے ارتعاش پیدا کر رکھا ہے کہ پاکستان کا طرزِ حکومت انسان ساختہ قوانین کے مطابق ہو گا یا قوانینِ

خداوندی کے مطابق۔

پاکستان مجلس دستور ساز کا سب سے پہلا اور اہم کام یہ تھا کہ وہ واضح الفاظ میں بتا دیتی کہ اصولاً پاکستان کا نظامِ حکومت کیا ہوگا۔ اگر پاکستان کو واقعی ایک اسلامی مملکت بنانا مقصود ہے تو مجلسِ دستور ساز کو اس کے متعلق مستند اعلان کر دینا چاہیئے تھا اور اگر (خدانکردہ) عمائدینِ پاکستان کا خیال ہے کہ انھوں نے اسلامی حکومت اور قرآنی نظام کے وعدے صرف اس خیال سے کئے تھے کہ ان سے بہتر عوام المسلمین کو مجتمع کرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا اور کہ ان کا مقصود پاکستان کو (Secular) اسٹیٹ بنانا ہے تو انھیں اس امر کا بھی واشگاف اعلان کر دینا چاہیئے تھا تاکہ قوم کو اس الجھن اور پراگندگی سے مخلصی مل جاتی جو اس کے ذہن میں پیدا ہو چکی ہے۔ اس مسئلہ کو زیادہ عرصہ تک تذبذب کی حالت میں رکھنا مختلف خرابیوں کا موجب ہو سکتا ہے۔

مجلسِ آئین ساز کے ارکان اپنے اس اہم فریضہ اور عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوئے جس سے ایک گروہ اس خدشے کا اظہار کر رہا ہے کہ پاکستان میں اسلامی آئین کا نفاذ نہیں ہوگا۔ اس گروہ کے اس خدشہ اور اسلامی حکومت کے قیام کے مطالبہ کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کے ذمہ دار حضرات نے اپنی پبلک تقاریر میں پھر کہنا شروع کر دیا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی۔ چنانچہ لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان نے ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ کے ایک اجتماع میں کہا:

> ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک قطعۂ ارض حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔ (ڈان ۱/۴۸ ۱۴)

اگلے روز انھوں نے اہالیانِ پشاور کے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے کہا:

> پاکستان صحیح معنوں میں ایک اسلامی سٹیٹ ہو گی جس میں عدل و انصاف اور مساوات کے اسلامی اصولوں کا نفاذ ہوگا اور طبقاتی امتیاز ختم کر دیا جائے گا۔ پاکستان ہماری ایک تجربہ گاہ ہو گی اور ہم دنیا کو دکھا سکیں گے کہ تیرہ سو سال پہلے کے اصول آج بھی کارآمد ہو سکتے ہیں۔
>
> (ڈان ۱/۴۸ ۱۵)

اسی قسم کے خیالات کا اظہار، وزیرِ اعظم پاکستان نے سرحدی قبائل کے متفرق اجتماعات اور راولپنڈی کے ایک جلسۂ عام میں بھی کیا۔

۸ر جنوری ۱۹۴۸ء کو پاکستان کے وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر نے چاٹگانگ میں ایک تقریر کے دوران میں کہا:

جو معترضین پاکستان کو اسلامی سٹیٹ بنانے پر اعتراض کرتے ہیں وہ جانتے ہی نہیں کہ اسلامی سٹیٹ سے مطلب کیا ہے۔ اسلامی سٹیٹ سے ایک ایسی سٹیٹ مراد ہے جہاں انسانوں میں مساوات ہو اور رواداری اور معاشرتی انصاف پر سختی سے عمل کیا جائے۔ (ڈان ۱/۴۸ ۱۴)

۲۵ر جنوری ۱۹۴۸ء کو کراچی میں سندھ بار ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام جلسۂ سیرت النبیؐ میں تقریر کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے ارشاد فرمایا:

میں تو یہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ لوگوں کو اس استفسار کی ضرورت کیوں پڑ رہی ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہوگا یا نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسلامی اصول تو ایسے ہیں جن کی نظیر دنیا میں کوئی بھی پیش نہیں کر سکتا۔ یہ اصول آج بھی اسی طرح کارآمد ہیں جس طرح آج سے تیرہ سو سال بیشتر تھے۔ (ڈان ۱/۴۸ ۲۶)

مسلمان اس وقت، اس باب میں، جس ذہنی پراگندگی کا شکار ہیں اس سے وہ تین گروہوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔

(۱) وہ مسلمان جو دیانتداری سے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلامی حکومت ایک ناممکن العمل چیز ہے اور کہ پاکستان کو ایک (Secular) سٹیٹ بننا چاہیے۔

(۲) وہ مسلمان جو کہتے تو ہیں کہ پاکستان میں قرآنی نظام کا نفاذ ہوگا لیکن جن کے دل، اس بارے میں ان کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہے۔

(۳) وہ مسلمان جو دل سے چاہتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے لیکن ان کے سامنے اس قسم کی حکومت کا کوئی خاکہ موجود نہیں۔ وہ بتا نہیں سکتے کہ اسلامی حکومت دراصل کہتے کسے ہیں

اول الذکر گروہ سے وہ جو "ایمان دار بے ایمانوں" پر مشتمل ہے، خطاب فضول ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نظریں جلوۂ دانشِ فرنگ نے خیرہ کر رکھی ہیں اور جن کی نگاہوں میں کوئی ایسی چیز جچ نہیں سکتی جس پر لندن یا ماسکو کی مہر ثبت نہ ہو۔ ان کے نزدیک کوئی ایسا نظام قابلِ قبول نہیں ہو سکتا جو مغربی مادہ پرستی کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔ لہٰذا یہ گروہ اِس موضوع کے پیشِ نظر مرفوع القلم ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جسے ہم "بے ایمان ایمان دار" کہہ سکتے ہیں۔ پہلے اور دوسرے گروہ میں فرق یہ ہے کہ ایک، زبان سے اسی چیز کا اظہار کرتا ہے جو اس کے دل میں ہے اور دوسرا، اس بات کا اعلان کرتا ہے جو اُس کے دل میں نہیں۔ یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم۔ یہ گروہ یا تو بزدل ہے کہ اپنے دلی معتقدات کے اظہار سے ڈرتا ہے یا فریب کار کہ اپنے موجودہ دنیاوی مراتب کو برقرار رکھنے کی خاطر وہ بات کہتا ہے جس سے اُسے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہونے کی امید ہو سکتی ہے۔ اگر آج اسے یقین ہو جائے کہ اسلام کا نام لئے بغیر بھی وہ اپنی سیادت قائم رکھ سکتا ہے تو وہ اس تکلف کو فی الفور چھوڑ دے اِس گروہ کے وابستگانِ دامن کے گذشتہ کردار پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں اُن کی کتابِ زندگی کا کوئی گوشہ بھی اسلامی آئین سے تطابق رکھتا دکھائی نہیں دیتا۔ اور اس بنا پر ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج بھی اسلام و قرآن سے ان لوگوں کی والہانہ شیفتگی ایک فریب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ انھوں نے عوام کی نازک رگ کو پہچان لیا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عوام کے ذہن اس چیز کو سننے اور برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جو اُن کے قلوب کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے۔ ان کے دعاوئ اسلام پرستی اس منافع باز تاجر کی حرکت سے مختلف نہیں جو اپنی دکان کی ساکھ کو قائم رکھنے کے لئے گاہکوں کے سامنے جھوٹی قسمیں کھاتا ہے۔ ان لوگوں سے ہم گذارش کریں گے کہ وہ قوم سے مذاق کرنا چھوڑ دیں۔ ان کی قیادت کے ایوان ریت کے ستونوں پر استوار نہیں رہ سکتے۔ اس لئے جس قدر جلد وہ اس فریب کاری، ملمع سازی اور منافقت کو ترک کر دیں، بہتر ہے۔

تیسرے گروہ کے قلب و دماغ میں تطابق ضرور ہے وہ ایمانداری سے چاہتا ہے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کی جائے لیکن وہ یا تو جانتا نہیں کہ اسلامی حکومت سے اس کا مفہوم کیا ہے۔

یا اگر اس کے دماغ میں اس کا کوئی تصور موجود ہے تو وہ مسخ شدہ یا نامکمل ہے۔ اس گروہ میں وہ حضرات شامل ہیں جن میں سے ہر ایک کی یہ کیفیت ہے کہ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ۔ ان میں سے اسلام قرآنی نظام اور حکومت الٰہیہ کے متعلق ہر ایک کا تصور الگ الگ ہے۔ ہر ایک نے چند ظواہر و رسوم کو "اسلام" کا نام دے رکھا ہے اور اپنے زعم میں یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اپنی ظواہر و رسوم پر بہ جبر پابندی کا نام اسلامی حکومت ہے یہ لوگ چند جزئیات کو مکمل اسلام سمجھے بیٹھے ہیں۔ اسلامی حکومت اور قرآنی قانون کے نفاذ کے متعلق ان کے مطالبات کا بالعموم خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان بھر میں اتوار کی بجائے جمعہ کو تعطیل ہوا کرے، شراب خانوں اور قحبہ خانوں کی بندش کا اعلان کر دیا جائے، جوئے کو قانوناً ممنوع قرار دیدیا جائے نکاح، وراثت قسم کے معاملات فقہی قواعد کے مطابق طے پائیں وغیرہ وغیرہ۔ ایسا ہو گیا تو یہ سمجھ لیا جائے گا کہ اسلامی حکومت کا نفاذ عمل میں آگیا ہے۔ اگر وہ قرآنی نظام اسی قدر ہے جس کے قیام کے لئے ہم نے دس برس شدائد و مصائب کا مقابلہ کیا اور جس کے لئے لاکھوں مسلمانوں کا خون پانی سے بھی ارزاں ہو گیا تو ہمیں اعتراف کر لینا چاہیئے کہ ہم نے ایک ایسی چیز کے لئے مسلمانوں کے قوٰی اور وقت کا بے دردانہ ضیاع کیا۔ جو ہمیں پہلے ہی حاصل تھی۔ انگریزی حکومت میں ضابطۂ تعزیراتِ ہند کی کون سی دفعہ کی رُو سے ہمیں نماز، روزہ اور دیگر ارکانِ اسلام کی ادائیگی سے روکا جاتا تھا؟ انگریز کے قانون نے کب ہمیں مسجدوں میں جانے، باجماعت نماز ادا کرنے، قرآن چھاپنے اور پڑھنے سے روکا ہے؟ کیا کبھی کسی مسلمان کو زبردستی شراب پلائی گئی یا بدکاری پر مجبور کیا گیا؟ اگر قرآنی نظام اسی قدر ہے تو یہ تو ملکۂ وکٹوریہ نے اپنے شہرۂ آفاق اعلان میں آج سے نوے سال بیشتر ہی نافذ کر دیا تھا جس میں ہر قوم کے مذہب، زبان اور ثقافت کی آزادی اور تحفظ کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس "قرآنی نظام" کی ضمانت کانگرس بھی اپنی مشہور قرارداد کراچی کی صورت میں دے چکی ہے۔ آخر وہ کونسا نظام تھا جس کے قیام کے لئے وکٹوریہ کا اعلان اور کانگرس کا کراچی ریزولیوشن کافی نہ سمجھا گیا؟ اگر محض چند اخلاقی اصولوں کے نفاذ اور رسوم ظاہری کی آزادی کے لئے قوم کو گوناگوں مصائب و آلام کا شکار بنایا گیا ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم نے اس جنس کی غیر متناسب اور بہت بڑی قیمت

ادا کی ہے۔ اگر محض "سجدے کی اجازت" ہی "اسلام کی آزادی" ہے تو کہنا پڑے گا کہ ہم نے دس سال تحصیلِ حاصل میں گذار دیئے۔

آیئے ہم دیکھیں کہ اسلامی حکومت اور قرآنی نظام یہی کچھ ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یا اس سے مختلف اور بلند چیز ہے۔ آخر الذکر گروہ کی غلط اندیشی اسی بنیادی غلطی کی پیداوار ہے جس سے اسلام کو بھی انہی معنوں میں مذہب سمجھ لیا گیا ہے جن میں دوسرے مذاہب سمجھے جاتے ہیں۔ عام طور پر مذہب کو ایک نجی (پرائیویٹ) چیز سمجھا جاتا ہے جس کا تعلق صرف بندے اور خدا کے درمیان ہوتا ہے اور جس کا تعلق انسان کی "غیر مذہبی" زندگی سے نہیں ہوتا۔ یہ "مذہب" چند مظاہر و رسوم کا مجموعہ ہوتا ہے اسلام ان معنوں میں مذہب نہیں۔ یہ چند ظواہر و رسوم یا محض عبادات کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انسان کی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ جزو اس کی دسترس سے باہر نہیں۔ لہٰذا جب ہم اسلام کا نام لیتے ہیں تو اس سے مراد "پورا" اسلام ہوتا ہے۔ چند جزئیات کو لے کر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ "پورا" یا صحیح اسلام ہے۔ اسی لئے ارشاد ہوتا ہے کہ فَادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً (اسلام میں پورے طور پر داخل ہو جاؤ)۔ اگر ہمارے پیشِ نظر مکمل اسلام نہ ہو تو وہ اسلام نہیں بلکہ کچھ اور ہی شے ہے۔ اسلام کا ایک حصہ اسلام نہیں ہو سکتا۔ اسلام ایک خالص چیز ہے جس میں غیر اسلام کی ہلکی سی آمیزش بھی اسے اسلام نہیں رہنے دیتی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ دودھ سے بھرے ہوئے مٹکے میں دہی کی چند بوندیں ڈال کر اسے دودھ نہیں کہہ سکیں گے۔ اسلام میں غیر اسلام کی ملاوٹ سے یہ اسلام نہیں رہے گا۔ اس لئے کہ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ۔ حق کے ساتھ باطل ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ یا وہ خالص حق ہوگا یا خالص باطل۔ یہاں پر التباسِ حق اور باطل یعنی اسلام اور کفر میں مفاہمت (Compromise.) کا تصور ہی غلط ہے۔ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ دو اور دو پانچ بھی غلط ہیں اور تین بھی غلط۔ اس حق اور باطل میں مفاہمت اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ہم دو اور دو ساڑھے چار یا ساڑھے تین تسلیم کر لیں۔ لیکن یہ مفاہمت حق کو حق نہیں

رہنے دیگی بلکہ باطل کردے گی۔ حق اور باطل کی آمیزش سے حق، حق نہیں رہتا۔ اسی طرح اسلام یا تو سو فیصدی اسلام ہوگا یا سرے سے اسلام ہوگا ہی نہیں۔ اسی لئے قرآن کے نزدیک اُن لوگوں کے اعمال قابلِ قبول نہیں ہوسکتے جو یُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَيَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ یعنی کچھ باتوں کو تو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے۔ اس لئے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (جو شخص اپنے فیصلے قرآن کے مطابق نہیں کرتا وہ زمرۂ کفار میں داخل ہے)۔

ان تصریحات سے آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ اسلام کو جس رنگ میں پیش کیا جارہا ہے وہ اس کے طبعی خط و خال سے یکسر مختلف ہے۔ اور اس "اسلام" کے اصولوں کے نفاذ کو ہم اسلامی حکومت کا نام نہیں دے سکتے۔ چند فقہی اصولوں کے اجرا کے بعد ہم یہ کہہ کر اطمینان سے نہیں بیٹھ سکتے کہ ہم نے قرآن کا قانون نافذ کردیا ہے۔ اسلامی حکومت اور قرآنی نظام سے مقصود ایسی فضا کی تخلیق ہے جس میں ہر انسان کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق مساوی مواقع مہیا کئے جائیں۔ حکومت کی طرف سے مہیا کردہ سہولتیں اور مراعات ہر شخص کے لئے مساوی ہوں۔ ترقی اور بلندیٔ مناصب کا معیار پیدائش نہ ہو بلکہ اہلیت۔ مدنی حقوق سے ہر شہری کو متمتع ہونے کا پورا موقع دیا جائے۔ قانون کی نظر میں ادنیٰ و اعلیٰ، غریب و امیر، "بندہ و مولا" سب برابر ہوں۔ ہر آدمی کو اس کے طبعی رجحانات و میلانات کو بروئے کار لانے کی سہولیات مہیا کی جائیں۔ کسی شہری کو محض اس کمی کی وجہ سے ترقی کے مواقع سے محروم نہ کیا جائے کہ وہ اتفاق سے ایک ادنیٰ گھرانے میں پیدا ہوا ہے۔ حکومت مواقع کی بہم رسانی میں تجمل یا امتیاز روا نہ رکھے۔ حکومت کا کام یہ ہو کہ وہ تعلیم و تربیت اور مسابقت کی راہیں کھول دے۔ بعینہٖ اسی طرح جیسے بجلی مہیا کرنے والا انجن اپنی قوت برابر مقدار میں سب کو مہیا کرتا ہے اگر پانچ نمبر کا برقی قمقمہ اس قدر برقی قوت جذب نہیں کرسکتا جتنی مونمبر یا ہزار نمبر کا تو اس میں اس کی اپنی صلاحیت کا قصور ہوتا ہے نہ کہ سرچشمۂ برق کا۔ اگر حکومت کے منبعِ فیوض سے کوئی شخص پورا فائدہ نہ اٹھا سکے تو اس میں حکومت کا نہیں بلکہ اس کے اپنے فطری جوہر کا قصور ہوگا۔

لیکن ان سب سے بلند، جس اصلِ عظیم پر اسلامی نظام کی اساس ہے وہ اس حقیقتِ کبریٰ پر ایمان ہے کہ انسان اپنے تمام معاملات میں اپنے خدا کے سامنے جواب دہ ہے اور اس کی کوئی حرکت، قلب کی لرزش یا نگاہ کی جنبش، اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کے دائرہ سے باہر نہیں رہ سکتی۔ اور یہ کہ اعمال کا ظہور نتائج، سلسلۂ تنفس کی آمد و رفت تک ہی محدود نہیں بلکہ زندگی ایک جوئے رواں ہے۔ اور طبیعی موت سے اس کی روانیوں میں انقطاع واقعہ نہیں ہو جاتا۔ اس اصلِ عظیم سے شرفِ انسانیت کی جو کونپل پھوٹتی ہے وہ اعمالِ صالحہ کی آبیاری سے رفتہ رفتہ ایک شجرِ بلند و بالا کی صورت میں کہکشاں گیرو ثریا بوس ہو جاتی ہے اور اس طرح یہ آدمِ خاکی، ارتقائے جوہرِ انسانیت سے، سدرۃ المنتہیٰ کی بلندیوں تک جا پہنچتا ہے۔ وفیہا عیشۃ راضیۃ۔ فقہی احکامات اور عبادات و مناسک اسی اصلِ عظیم کے مظاہر ہیں۔ ان کی اہمیت کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کہ کلیوں کو توڑ کر پھینک دینے والے کو پھل کی امید قطعاً نہیں رکھنی چاہیے۔ لیکن یہ احکام و مناسک اس نظام کے مظاہر ہیں، اس کی اصل وہ ایمان ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ قرآنی نظام کی اساس اس ایمان پر ہو گی اور اس کے بعد یہ پورے کا پورا نظام (نہ کہ اس کے بعض احکام و مناسک) ہماری زندگی کے ہر شعبے کو احاطہ کر لے گا۔ لہٰذا نکاح و وراثت کے احکام کی ترویج، یا چند فواحش و منکرات کی بندش سے یہ سمجھ لینا کہ اسلامی نظام کا نفاذ ہو گیا، اپنے آپ کو فریب دے لینا ہے۔ اسلامی نظام، انسان کی پوری زندگی کو بدل دیتا ہے اس کا سرچشمہ، عمقِ قلب ہوتا ہے۔ اگر کسی نظام سے ہماری زندگی میں ایسی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی تو سمجھ لیجئے کہ وہ نظام اسلامی نہیں۔ نگاہ کا فریب ہے، ظواہر پرستی کا دھوکا ہے۔ اگر اسلامی نظام کا تقاضا کرنے والوں کے پیشِ نظر، اسلامی نظام سے مفہوم، محض چند ظواہر کی ترویج ہے۔ اور اگر اسلامی نظام کے قیام کا اعلان کرنے والے بھی ایسا ہی کچھ سمجھ رہے ہیں تو جتنی جلدی یہ اس دھوکے سے نکل سکیں بہتر ہو گا۔ اس لئے کہ خود فریبی دنیا میں بہت بڑی خرابیوں کا موجب ہوا کرتی ہے۔

اس کے بعد ہم پاکستان کے اربابِ اختیار سے سیدھا سا سوال کرنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ

فی الواقعہ اس قسم کی فضا کی تخلیق چاہتے ہیں جس کا مجمل سا خاکہ سطورِ بالا میں پیش کیا گیا ہے؟ کیا وہ اپنی دنیوی وجاہت کو ان بلند اصولوں کی خاطر قربان کر سکتے ہیں؟ اور آئندہ ان اصولوں کی برقراری کی تاب رکھتے ہیں؟ اگر وہ یہ سب کچھ کر سکیں اور کرنا چاہیں تو غیر ضروری تاخیر کے بغیر پاکستان مجلس دستور ساز کے اجلاسِ رواں میں اس امر کا واضح اعلان کر دیں۔ اس اجلاس میں دنیا کو معلوم ہو جانا چاہیئے کہ پاکستان کا مستقل دستور کیا ہوگا! قوم کو زیادہ دیر تک ذہنی کشمکش میں مبتلا رکھنا کسی صورت میں بھی قرینِ دانشمندی نہیں۔ قوم مجلسِ دستور ساز کے ارکان سے ایک ایسے ذمہ دارانہ اعلان کی توقع رکھتی ہے جس میں ذرہ برابر بھی ابہام کی گنجائش نہ ہو۔ اور اگر یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہوگا تو آپ کو اسلامی تنفیذ کے لئے تفصیلات طے کرنے کا کام فی الفور شروع کر دینا چاہیئے جب یہ طے ہو جائے گا کہ ہماری مملکت میں قرآنی نظام کا قیام ہوگا تو اس صورت میں ہمارا کام آئین کی تاسیس نہیں رہے گا۔ اس لئے کہ ہمارے پاس ایک مکمل ضابطہ قوانین (قرآن) موجود ہے۔ ہمارا کام صرف اس ضابطہ کی تنفیذ ہوگا۔ آئین کے اصول ہمارے پاس موجود ہیں۔ ان کی جزئیات ہم طے کر سکتے ہیں۔ قرآن کے بنیادی اصولوں میں ہم تغیر و تبدل کا حق نہیں رکھتے، ان اصولوں کے حدود کے اندر، اپنے زمانہ کے مقتضیات و داعیات کے پیشِ نظر تفاصیل میں ردوبدل ہر وقت کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی حکومت کا یہی فریضہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ خلوصِ دل سے اسلامی حکومت کا قیام چاہتے ہیں تو یہ نہ سوچیئے کہ فلاں ملک کا آئین دنیوی ہے اور ہماری ہمسایہ مملکت میں بھی دنیوی آئین کے نفاذ کا "وعدہ" کیا گیا ہے۔ غیر مسلموں کا طرزِ عمل ہمارے کسی طرزِ عمل کے لئے وجہِ جواز نہیں ہو سکتا۔ ان کے پاس کوئی ایسا نظام و آئین موجود ہی نہیں جسے وہ نافذ کر سکیں۔ ناچار انھیں نظام و آئین کے انہی خاکوں کی تقلید کرنی پڑتی ہے جو وقتاً فوقتاً انسانوں نے تشکیل کئے اور وقت کے تقاضوں نے جن کی صورتیں بارہا مسخ کیں۔ ہمارے پاس ایک اکمل ترین دستور و آئین کا مجموعہ موجود ہے لہٰذا ہم ہدایت کے لئے غیروں کے محتاج نہیں ہو سکتے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن　　نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اگر اس اہم فریضہ کی ادائیگی کے لئے آپ اپنے اراکین میں ایسے حضرات نہیں پاتے جن میں اس کی کماینبغی صلاحیت ہو، تو اس کے اعتراف میں کسی قسم کی جھجک نہیں ہونی چاہیئے۔ اس صورت میں، مجلس دستور ساز سے باہر ایسے حضرات کو تعاون کے لئے مدعو کیا جا سکتا ہے، جن میں اس کام کی صلاحیت ہو۔ ترتیبِ ضابطۂ نظامِ قرآن کا کام مشکل نہیں ہوگا۔ سوال صرف یہ ہے کہ آپ ایسا چاہتے بھی ہیں۔

اور اگر آپ (خدانکردہ) یہ سمجھتے ہیں کہ اس آئین کی پابندیاں آپ پر گراں گذریں گی، یہ آپ کی مصلحت اندیشیوں کے منافی ہوگا۔ تو پھر زبان سے اس آئین کی ترویج کے دعاوی کو چھوڑ دیجئے۔ یہ ـــــ منکری بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن ـــــ کی روش زیادہ عرصہ تک کامیاب نہیں رہ سکے گی۔ خدا کرے ہمارے اربابِ بست و کشاد کی سمجھ میں یہ بات آجائے۔

کچھ بھی نہیں!

(اسد ملتانی)

گر پاکستان میں مذہب کی توقیر نہیں تو کچھ بھی نہیں
آزادی میں بھی ملّت کی تعمیر نہیں تو کچھ بھی نہیں

ملّت میں اگر قوّت ہی نہ ہو آئیں کا تحفّظ ناممکن
مذہب کی حفاظت کرنے کو شمشیر نہیں تو کچھ بھی نہیں

تقریروں میں قرآن کی تعریفیں کرنا اچھا لیکن
دل کی گہرائی میں اس کی توقیر نہیں تو کچھ بھی نہیں

کتنا ہی بلند و خوش منظر ایوان ہو جمہوریت کا
اسلام کی بنیادوں پہ اگر تعمیر نہیں تو کچھ بھی نہیں

سرحد کے مجاہد دیتے ہیں پیغام یہ قائدِ اعظم کو
گر پاکستان کے حلقے میں کشمیر نہیں تو کچھ بھی نہیں

دِل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

قوم، انسانوں کے ہجوم اور انبوہ کا نام نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ عبارت ہوتی ہے انسانوں کے اُس مجموعہ سے جن میں یک دلی اور یک رنگی، ہم آہنگی اور ہم خیالی ہو۔

یک رنگی اور یک دلی اُس صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب اُس قوم کی تعلیم مشترک ہو، تاکہ ان کے قلب و دماغ کی تعمیر ایک ہی نقشہ کے مطابق ہو اور ان کی ذہنی اور فکری صلاحیتیں ایک ہی قالب میں ڈھل کر باہر نکلیں۔ لہٰذا تعمیرِ پاکستان میں سب سے مقدم سوال، تعلیم کا ہے۔ اگر ہماری تعلیم صحیح نہج و اسلوب پر شروع ہو گئی تو سمجھ لیجئے کہ ہماری ملی عمارت کی بنیاد صحیح خطوط پر اُٹھے گی، اور اگر اس کی طرف سے ایسا ہی تساہل و تغافل برتا گیا جیسا کہ ہم نے اس سے پیشتر برتا ہے تو انسانوں کا یہ "منتشر مجموعہ" تاقیامت، قوم نہیں بن سکے گا۔ میں نے "منتشر مجموعہ" کی متضاد ترکیب دانستہ استعمال کی ہے اس لئے کہ قرآن نے ایسے گروہ کے متعلق جو بظاہر اکٹھا نظر آئے لیکن جن کے دلوں میں اشتراک نہ ہو، فرمایا ہے کہ تحسبھم جمیعا و قلوبھم شتا (تو انھیں "مجموعہ" خیال کریگا حالانکہ وہ مجموعہ نہیں ہیں کیونکہ ان کے قلوب ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں)۔ اس کا نام "منتشر مجموعہ" ہے۔ قوموں میں وجہ جامعیت قلبی ائتلاف ہوتا ہے نہ کہ پیکروں کا اجتماع۔ تعلیمی اشتراک کے بغیر قلبی اشتراک ناممکن ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ تعلیمی اشتراک کے لئے ضروری ہے کہ ہماری اساس و بُنیاد ایک ہو۔ جب ہم کہتے ہیں کہ تمام روئے زمین کے مسلمان ایک ملّتِ واحدہ کے افراد ہیں۔ تو اس سے مفہوم یہ ہے کہ ان کی تعلیم کی اساس و بُنیاد ایک ہے۔ ان کا اختلافِ رنگ و زبان اور طریقِ بُود و ماند، فرعی ہے۔ اصل کے اعتبار سے ان میں کوئی اختلاف نہیں۔

وہ اَساس و بُنیاد، جسے ہم نے تمام مسلمانانِ عالم کے لئے مُشترک قرار دیا ہے اور جس پر ان کی ملّی عمارت کو تا بہ ثُریّا اُستوار ہونا ہے، قرآن اور تاریخ ہے۔ قرآن، یعنی وہ ضابطۂ قوانین جو ان کی زندگی کے ہر شعبہ میں سرچشمۂ ہدایت ہے۔ اور تاریخ، یعنی اس بات کا علم کہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں اس سرچشمۂ ہدایت پر عمل کس طور پر ہوتا رہا ہے۔

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، میرا خیال ہے کہ دنیا کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جو اس سے زیادہ پڑھی لیکن اس سے کم سمجھی جاتی ہو۔ اور مقامات کو چھوڑیئے۔ ہمارے اسلامیہ اسکولوں اور کالجوں میں بھی جس انداز سے قرآن کی تعلیم دی جاتی ہے، اس کا نتیجہ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ جن کالجوں میں مذہب کی تعلیم نہیں دی جاتی وہاں کے طالب العلم زیادہ سے زیادہ دین سے بیگانہ رہ جاتے ہیں لیکن جہاں مذہبی تعلیم دی جاتی ہے وہاں کے طالب العلم مذہب سے متنفر ہو کر نکلتے ہیں۔ اس لئے کہ وہاں اُنھیں ایک طرف فلسفہ اور طبعیات کی تعلیم میں آسمانِ علم کی بلندیوں تک لے جایا جاتا ہے اور جب مذہبی تعلیم کا وقت آتا ہے تو انھیں قصص و روایات اور اساطیر و اباطیل کی پستیوں میں دھکیل دیا جاتا ہے جس سے ان کا ذہن، خود دین ہی سے بیزار ہو جاتا ہے۔ جب ہمارا ایمان ہے کہ قرآن، انسان کو دنیائے علم کے افقِ اعلیٰ تک لے جاتا ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے تو اس کی تعلیم اس انداز سے ہونی چاہیئے کہ اس ایمان کو ہم اپنے قلب کی گہرائیوں اور ذہن کی بلندیوں میں محسوس کریں۔ ہماری زندگیاں، قرآنی قالب میں اُسی صورت میں ڈھل سکتی ہیں کہ ہم قرآنی تعلیم کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھیں اور اُسے علیٰ رؤس الاشہاد، دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ اسلئے ضروری ہے کہ قرآنی تعلیم کا ایسا نصاب تیار کیا جائے جو ابتدائی جماعتوں سے لیکر انتہائی مدارج تک، طالب العلم کی ذہنی استعداد کے ساتھ ساتھ چلے اور اس طرح درجہ بدرجہ اُسے پورے قرآن پر عبور حاصل ہو جائے۔ یہ کام انفرادی کوششوں کے سپرد نہیں کرنا چاہیئے بلکہ حکومتِ پاکستان کو خود اپنے ذمے لینا چاہیئے۔ ہمارے اکابرین حکومت اکثر و بیشتر اسکا اعلان فرماتے رہتے ہیں اور اگر وہ اسکا اعلان نہ بھی کریں تو بھی یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کا آئین قرآنی ہوگا۔ مرکزی حکومتِ پاکستان کے وزیرِ تعلیم، محترم فضل الرحمٰن صاحب نے ※

※ حال ہی میں، ڈھاکہ میں ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا

مسلمان بچوں کے لئے مذہبی تعلیم لازمی ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس تعلیم کی اساس،
اسلامی تصوراتِ زندگی پر رکھی جائے گی۔ (ڈان۔ ۲۱ فروری ۱۹۴۸ء)

ان مقاصدِ پیشِ نظر کے لئے ضروری ہے کہ مرکزی حکومت ایک ایسا ادارہ قائم کرے جس میں قرآن کے متعلق ایسی ریسرچ ہو جس سے پاکستان کا آئین مستنبط ہو، اور ایسا نصاب تیار کیا جائے جو ہماری درسگاہوں (اسکولوں اور کالجوں) میں شروع سے اخیر تک رائج کیا جا سکے۔ اس ادارہ کیلئے ملک میں اچھے اچھے اہل فکر و نظر حضرات مل جائیں گے۔ ابتدا کرنے کے لئے دور کیوں جائیں خود معارف القرآن کے مصنف (محترم پرویز صاحب) مرکزی حکومت کے دفاتر میں موجود ہیں۔ میرا خیال ہے کہ قرآن پر اس انداز کی تصنیف شاید ہی کوئی دوسری ہو۔ معارف القرآن ہمارے کالجوں میں قرآنی نصاب کے لئے بہترین کتاب ہو سکتی ہے۔ انہی کا ایک مختصر سا رسالہ، اسلامی معاشرت، ابتدائی جماعتوں کے لئے بیحد مفید ہو سکتا ہے۔ بہرحال مقصد یہ ہے کہ حکومتِ پاکستان کو چاہیئے کہ ایک ایسا ادارہ قائم کرے جس میں قرآن جاننے والے حضرات کے سپرد، ترتیبِ نصاب کا اہم شعبہ کر دیا جائے۔

دوسری چیز تاریخ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مذکورۂ صدر ادارہ کا دوسرا حصہ، تاریخ کا نصاب مرتب کرنے کے لئے مقرر کر دینا چاہیئے۔ انگریزی نصاب میں شاہراہ تاریخ (Highroads of History) کا سلسلہ نہایت دلکش، آسان اور مفید ہوا کرتا تھا (شاید اب بھی ہو) اس نہج پر اسلامی تاریخ کے سلسلۂ نصاب کے مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لئے بھی موزوں حضرات کی کمی نہیں ہوگی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے میرے سامنے تاریخ الامت کے مصنف، مولانا اسلم صاحب جیراجپوری، آتے ہیں۔ ان کی تاریخ نہایت مستند اور مقبول ہے اور اکثر مدارس میں اب بھی بطورِ نصاب داخل ہے۔ حضرت مولانا کا تبحر علمی اور تدبر قرآنی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان سے اس مقصدِ جلیلہ کے لئے درخواست کی جائے تو وہ اسے بخوشی منظور فرمالیں گے۔ اسی طرح دیگر اہل علم حضرات کو بھی دعوت دی جا سکتی ہے۔ جب کام کی ابتدا ہو جائے گی تو پھر

کشادِ راہ کی بہت سی صورتیں سامنے آجائیں گی اور موزوں حضرات کی بھی کمی نہیں رہے گی۔ مقصد تو ابتدا کرنے سے ہے۔

میں نے نہایت مختصر الفاظ میں اپنی تجویز کو پیش کیا ہے۔ میں حکومتِ پاکستان کے اربابِ تعلقہ سے درخواست کروں گا کہ وہ اس باب میں تاخیر نہ فرمائیں اور اس سلسلہ کی ابتدا جلد از جلد کردیں۔ جو حضرات میری اس تحریک سے متفق ہوں اُن سے گذارش ہے کہ وہ اپنی تائید کو بابِ حکومت تک پہنچانے میں تامل نہ فرمائیں۔

ابو شمیم، سراج پاکستانی

[سب سے پہلے طلوعِ اسلام اس مبارک تجویز کی بدل تائید کرتا ہے۔ اس پرچہ کی ایک کاپی، ایک تعارفی خط کے ساتھ، وزیرِ تعلیم، حکومتِ پاکستان، کراچی کی خدمت میں بھیجی جا رہی ہے جو حضرات اِس تجویز سے متفق ہوں وہ بھی اپنی تائیدات، محترم وزیر تعلیم صاحب تک پہنچا دیں۔

طلوعِ اسلام کے صفحات اس تجویز سے متعلق تمام تفاصیل و مباحث کے لئے نہایت خندہ پیشانی سے کھلے ہیں۔

مدیر طلوعِ اسلام]